۱۱
گرما / خزاں ۱۹۹۲

آج

ترتیب : اجمل کمال

محمد خالد اختر　　اسد محمّد خاں
نیرّ مسعود　　فہمیدہ ریاض
افضال احمد سیّد　　میروسلاو ہولب
سیمون دُ بووار　　ژاں ژینے

آج

اکتوبر ۱۹۹۲

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کمپوزنگ

پبلشرز یونائیٹڈ

۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک کراچی

ترتیب

محمد خالد اختر

۷

گدھوں کی برآمد کا قصّہ

اسد محمّد خاں

٥٨

آدمی نامہ

نیرّ مسعود

٦٩

اہرام کا میرمحاسِب

۷۳

نُدبہ

فہمیدہ ریاض

۸۹

یہ جو تنہائی
اک سحر میں
گریاں ہیں عشاق
مجسمہ
اک مچھوے کا جال

افضال احمد سیّد

۹۴

ہمارا قومی درخت
دریائے سندھ ہمارے دُکھ کیوں نہیں بہا لے جاتا
وہ آدمی جسے لڑکیوں کی جِلد پسند تھی
ایک زنگ آلود پِن
کتّے کی موت
ایک دشوار سوال
اسٹریلا ڈی کیوروز کی موت
ایمپریس مارکیٹ سے واپسی
ایک ناممکن لڑکی

میروسلاو ہولب

۱۰۵
مُردہ زباں کی نصابی کتاب
مدد کا ہاتھ نپولین سبق
ایک لڑکے کا سر قوّتِ پرواز
ساحل کہانی محبّت
حقیقت شام میں موت
ہوائی حملے کے پانچ منٹ بعد انتظار
ہم جنھوں نے قہقہہ لگایا
ہڈیاں انسان

سیمون دُ بووار

۱۲۵
ایک محبّت کی کہانی - ۱

انتخاب

ژاں ژینے

۱۸۳
خادمائیں

محمد خالد اختر

گدھوں کی برآمد کا قصّہ

آرلی فِفٹیز کے کراچی کا ایک چچا عبدالباقی ناولٹ

(اس ناولٹ کے سب کردار اصلی یا حقیقی ہیں۔ بعض نام فرضی ہیں کیوں کہ بعض لوگ اصلی ناموں سے بلایا جانا پسند نہیں کرتے۔ اصلی یا فرضی ناموں والے کچھ حضرات اگر زندہ ہوں تو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ کرنے سے پہلے اپنے وکیل کی فیس معلوم کر لیں۔ جن حیوانات کا اس میں ذکر ہے وہ بھی اصلی یا حقیقی ہیں۔ ان میں سے کسی کی ہتک مقصود نہیں۔)

یہ آغازِ بہار کی ایک ملگجی شام تھی۔ کراچی کی اُن شاموں میں سے ایک جب دل خودبخود حسینوں سے گلے ملنے کو چاہتا ہے اور تمھارے قدم آپ ہی آپ پیومنٹ پر والز سے ملتاجلتا رقص کرنے لگتے ہیں۔ پریڈی اسٹریٹ پر انڈیا کافی ہاؤس میں میری جیب سے کافی پینے کے بعد ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور میرے سوبرانی سگریٹوں سے دھواں چھوڑتے الفنسٹن اسٹریٹ میں دوسرے کراچی والوں کی طرح وہ رسم ادا کر رہے تھے جسے عرفِ عام میں مٹرگشت کہا جاتا ہے۔ قمیص پتلون میں چھیل چھبیلے ڈینڈی نوجوان؛ رنگین مسکراہٹوں اور بلاؤزوں میں ٹِپ ٹِپ کرتی مُشکی کرسچیئن لڑکیاں؛ سیاہ گول ٹوپیوں، گھٹنوں تک آتے بند گلے کے کوٹوں اور سفید تنگ پاجاموں میں نہایت معقول پارسی کاروباری آدمی؛ ہنستے ہوے خوش وضع کنبوں سے لدی پھندی، کلاپ کلاپ کرتی گھوڑاگاڑیاں (ان کے پیتل اور ٹین کے ساز چمکتے دمکتے) -- الفنسٹن اسٹریٹ کی رونق اپنے جوبن پر تھی۔ اور جیسا کہ میں نے روزنامہ "توپ و تفنگ" میں اپنے ایک کالم میں لکھا ہے، اگر ایک آدمی کا دل شام کو الفنسٹن اسٹریٹ میں گھومنے پھرنے سے نہیں کِھلتا تو اسے فوراً اپنےآپ کو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ (وکٹوریا روڈ پر ایک ٹافیاں

کھانے والا جرمن ڈاکٹر ہے، بہت اچھا، فیس چیک آپ سولہ روپے۔)

ہم اسٹریٹ کے درمیان میں بمبئے واچ کمپنی کے سامنے تھے کہ میرے ڈاڑھی والے ساتھی نے یک لخت اپنے گداز فربہ ہاتھ کو میرے ہاتھ سے جھٹک کر علیحدہ کیا، ایک غوطہ سا لگایا اور غائب ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک چوڑی سی پیٹھ بمبئے واچ کمپنی کے دروازے میں دکھائی دی، اور پھر میں نے اسے کھو دیا۔ مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ کراچی کے کم و بیش آدھے باشندے اُس کے قرض خواہ تھے، یا ان کو گمان تھا کہ وہ ان کا مقروض ہے۔ ان حالات میں الفنسٹن اسٹریٹ میں ہواخوری کرنا، خواہ تم نے ڈاڑھی لٹکا رکھی ہو اور میری ریشمی قمیص کے کلف زدہ سفید کالر میں بو لگائی ہوئی ہو، بالعموم خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

میں ابھی اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اودے تھری پِیس سوٹ میں ملبوس، ہینڈل بار مونچھوں والا ایک بھاری بھرکم آدمی ہاتھ میں بید لیے میری طرف آیا۔

"آپ کے ساتھ ایک ڈاڑھی والا آدمی ابھی ابھی چل رہا تھا،" اس نے بید کو بلاضرورت تہدیدی انداز میں ہلاتے ہوے کہا، "وہ کہاں بھاگ گیا ہے؟"

"کون سا آدمی؟" میں نے موقعے کی نزاکت کو فوراً محسوس کر لیا؛ ہم خلجی کافی تیزفہم لوگ ہیں۔ "میرے ساتھ تو کوئی نہیں تھا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ تمھارا--- آپ کا ہاتھ پکڑے ہوے تھا،" اس نے مونچھوں کو تیکھا کرتے اور بید کو اور زور سے ہلاتے ہوے کہا۔ "اس کی ڈاڑھی تھی، غالباً نقلی۔"

"میرا ہاتھ؟ --- میرا ہاتھ؟" میں حیرت کی تصویر تھا۔ "تم--- آپ کہتے ہیں میرا ہاتھ؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے حضرت؟"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کسی شخص ایچ اے باقی کو جانتا ہوں، اور میں نے کہا کہ میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ اس پر اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور اپنا بید جُھلاتا اور ناقابلِ ذکر باتیں بڑبڑاتا آگے بڑھ گیا۔

اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ میدان صاف ہے اور ہینڈل بار مونچھ کہیں نظر نہیں آ رہی، میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا بمبئے واچ کمپنی میں داخل ہوا جہاں چچا عبدالباقی ایک مسکین سے سیلزمین کو جلو میں لیے مختلف گھڑیوں اور کلاکوں کی قیمتیں دریافت کر رہا تھا۔ مچھلی کی آنکھوں والا مسکین سیلزمین چچا کو غالباً ترکی الاصل پاشا گمان کرتے ہوئے انتہائی مودّبانہ اور فرماں‌برداراںہ وضع اختیار کیے ہوئے تھا۔

میں نے چچا کو آنکھ کے اشارے سے بتایا کہ کوسٹ اب کلیئر ہو چکی ہے۔

چچا نے سیلزمین کو بتایا کہ اسے فوراً بیچ لگژری میں ایک اہم ڈنر پر پہنچنا ہے اور یہ کہ وہ کل اپنے سیکرٹری کو کاؤنٹر کے اوپر لگے ہوئے جڑاؤ کلاک کے لیے بھیجے گا جسے اس کے لیے محفوظ سمجھا جائے اور کسی اور گاہک کو ہرگز فروخت نہ کیا جائے۔ ہم دونوں دُکان سے باہر آ گئے۔

"یہ آدمی کون تھا چچا، تم جس سے بھاگے تھے؟" میں نے پوچھا، "میں نے اسے کہا کہ میرے ساتھ کوئی شخص نہیں تھا۔"

"نہایت نامعقول اور بےہودہ شخص ہے،" وہ بولا، "بھتیجے، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا نا کہ وہ آس پاس نہیں ہے۔"

"میں نے اس کا پوری طرح اطمینان کر لیا ہے۔ لیکن چچا یہ تھا کون؟ بڑے غصے میں تھا۔ مجھ پر بید سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔"

"اس کا نام میر مسکین علی ہے۔ بعض لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہیں بھولتے۔ دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہے، حالاں‌کہ میرا اس سے دور کا رشتہ بھی بنتا ہے۔ میرے ایک خالو جو پولیس میں تھے اور جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے، اس کی ساس کے پہلے شوہر تھے۔ بندر روڈ پر خالق دینا ہال کے پاس اس کی موٹر اسپیر پارٹس کی دکان ہے۔ اس کاروبار میں مَیں اس کا مینیجِنگ پارٹنر تھا، اور میرے ہونے سے اس کی دکان خوب چلی۔ تم تو میری کاروباری سوجھ بوجھ کو جانتے ہی ہو۔ ایک بار مجھے اپنی کار کے لیے -- وہی ویلزلے جس میں تم چڑھے ہو، جسے میں نے بیچ دیا ہے -- اسٹیئرِنگ راڈ کی ضرورت پڑی۔ وہ اِنکل روڈ پر ڈرائیو کرتے ہوئے ٹوٹ گئی تھی۔ میں ایک راڈ وغیرہ اس کی دکان سے، جس میں میرا حصہ تھا، اس کو بتا کر لے گیا۔

اُس وقت سے یہ شخص میری جان کے درپے ہے۔"

میں نے چچا کی ہمدردی میں ہینڈل بار مونچھ کی کمینگی اور کم ظرفی پر افسوس کرتے ہوئے اسے سخت سست کہا۔ پھر ہم ایک بیچ کی گلی سے ہوتے ہوئے وکٹوریا روڈ پر آ نکلے، کیوں کہ الفنسٹن اسٹریٹ اس واقعے کے بعد غیرمحفوظ ہو چکی تھی اور میر مسکین علی سے دوبارہ ملاقات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پیراڈائز پکچر ہاؤس پر "سیمسن اینڈ ڈیلائیلا" ابھی تک چل رہی تھی۔ چچا اسے میرے خرچ پر چوتھی بار دیکھنا چاہتا تھا کیوں کہ بقولِ خود علیگڑھ میں شیر کا شکاری ہونے کی وجہ سے سیمسن کے شیر کو پچھاڑنے کے سین سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سمجھابُجھا کر اسے اس ارادے سے باز رکھا اور بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا بکنگ آفس سے محفوظ فاصلے پر لے آیا۔ پھر ہم نکڑ پر کیفے جارج میں ڈنر کھانے آ بیٹھے (یہ ڈنر ٹائم تھا) جہاں چچا عبدالباقی کے زرخیز ذہن میں لاکھوں روپے کمانے کی اس اسکیم نے جنم لیا جس کی تفصیلات دوست احباب چِری ہوئی باچھوں کے ساتھ اکثر مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں۔ کیفے جارج پر مرغ بریانی مزے کی ہوتی ہے۔

مجھے ایک روز پہلے "توپ و تفنگ" کے دفتر سے اپنے کالموں کے معاوضے کا چیک موصول ہوا تھا، اور ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم خلجیوں کی جیب میں جب پیسے آتے ہیں ہم جودوسخا کے خُم لنڈھانے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتے۔ چچا عبدالباقی ہوٹل میں تین کورس کے کھانے کو ترجیح دیتا ہے، چناں چہ ہم نے بریانی کے علاوہ جھینگا مچھلی اور انڈوں کے حلوے کا آرڈر دیا۔ ہمارے ساتھ کی میز پر دو بیڑیاں پھونکتے کاروباری میمن بیٹھے تھے -- نیم گنجے، سر کے سیانے، تیز اُسترے۔ (میمنوں کو دیکھ کر کسی وجہ سے پینگوئن میرے ذہن میں آتے ہیں۔) گجراتی کا "ڈان" میز پر بچھائے وہ شدومد سے اس میں چھپی ایک خبر پر بحث کر رہے تھے۔ کبھی یہ دونوں پینگوئن ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرتے تھے اور کبھی ہماری سمت اپنی زکامی معنک نظریں ڈالتے ہوئے گجراتی میں۔

"عثمان بھائی، یہ کھبر مجاک لگتی ہے۔ سالا امریکا گدھے امپورٹ کر کے کیا کریں گا؟" ایک نے کہا۔

"مجاک وجاک نہیں! اکھبار کا کھبر ہے،" دوسرے نے کڑک چائے کی چسکی لیتے ہوے کہا- "مشینیں، موٹر، کاٹن، چمڑا، ہڈّی اِمپورٹ ایکسپورٹ ہو سکتا ہے تو گدھا یو ایس اے میں اِمپورٹ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اِدھر پڑھو- ایڈیٹوریل بولتا ہے؛ یو ایس اے چالیس ہجار گدھا پاکستان سے اِمپورٹ کرنا مانگتا ہے، جھٹ پٹ سے---"

"قوایک--- قوایک--- قوایک---"

"پَھکرے ماتری نے کھُد لکھا ہے--- قوایک---"

"کیوں؟ کیا اُدھر گدھا نئیں ہوتا؟ وہ اتنا گدھا کیا کریں گا؟"

"یہ ایڈیٹوریل بولتا ہے، اُدھر ڈاکٹر لوگ مالوم کیا ہے کہ گدھا کا دودھ کینسر پیشنٹ کے لیے شِفا ہے- اور پھر سالا سلیمان بھائی، یو ایس اے والا اسٹیک بڑا شوک سے کھاتا ہے- ابی وہ گائے بکری گھوڑا کا اسٹیک کھا سکتا ہے تو گدھا کا کیوں نئیں؟ گدھا چھوٹا گھوڑا ہے- میمن مسجد کے مولی سے پوچھو- بالکل حلال- پھر سالا ہالی وُڈ میں رومن فلموں میں کام کرنے کے لیے ہجاروں گدھا مانگتا ہے- اور پھر گھوڑا کا ریس ہو سکتا ہے تو گدھا کا کیوں نئیں؟ ہم لوگ اِدھر کلفٹن روڈ پر گدھاگاڑی کا ریس کرتا ہے یا نئیں؟--- قوایک---"

جب وہ گجراتی بولنے لگتے تھے تو ان کے چونچیلے منھوں سے قوایک قوایک سے ملتی جلتی آواز نکلتی تھی-

"قوایک--- قوایک--- قوایک--- قوایک---"

"قوایک--- قوایک--- قیں قیں---"

"اور سالا سلیمان بھائی، پَھکرے ماتری لکھتا ہے کہ شاید یو ایس اے والا ان گدھوں کو کھوب کھلاپلا کر موٹا کرے گا -- بالکل تھاروبریڈ گھوڑا کے قد کا -- اور پھر اس کو ایکسپورٹ کر دے گا- میکسیکو اسٹیٹ تم جانتا ہے- اُدھر، کیا گریب لوگ کیا سیٹھ لوگ، سب کے گھر میں دوچار گدھا بندھا ہوتا ہے- سالا سیٹھ کے پاس بیوک، شیورلیٹ، لنکن گاڑی یہ لمبی لمبی ہو گی تو نیچے صحن میں دو چار گدھا بھی بندھا ہو گا- اُدھر کا رسم ہے- اُدھر پچھلے سال گدھوں کی وبا میں ہجار، لاکھ گدھا کھلاس ہو گیا-- جھٹ پٹ--"

"قوایک--- قوایک--- قیں--- قوایک---"

"قیں--- قوایک--- قوایک--- قیں---"

ہم یہ دلچسپ اور پُرازمعلومات گفتگو سنتے رہے۔ دونوں پینگوئن ہماری لدی پھندی میز کو دیکھتے اٹھ کر کاؤنٹر کر طرف چل دیے اور ہوٹل والے لڑکے کی آواز آئی: "دو کڑک چائے، کھایا کچھ نہیں، پانچ آنہ!"

ان کے جانے کے بعد میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ چچا کے وسیع چہرے پر ایک نورانی وجدانی روشنی پھیلتی چلی جا رہی ہے جیسی کہ پرانے عہدنامے میں بشارت کے وقت خدا کے برگزیدہ بندوں کے چہروں پر پھیلا کرتی تھی۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

انڈوں کے حلوے کی پلیٹ ختم کر کے اسے سرکاتے ہوئے اس نے سرگوشی کی: "بھتیجے، توتے والے کی فال صحیح ثابت ہوتی لگتی ہے۔ پچھلے مہینے میں نے تفریحاً بندر روڈ پر ایک توتے والے سے چار آنے کی پرچی نکلوائی تھی۔ توتے نے پرچی لا کر مجھے دی تو کیا تمھیں معلوم ہے اس پر کیا لکھا تھا؟ بہت جلد بےشمار دولت تمھارے ہاتھ لگے گی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلد ہونے والا ہے۔"

"شہر میں بہت سے پہنچے ہوئے توتے ہیں۔ اگلے دن میں نے بھی---"

"بات سنو بھتیجے،" اس نے مجھے ٹوک کر سرگوشی کی، "جلدی سے حلوہ ختم کرو۔ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔"

"ہاں، میں نے بھی سنا ہے کہ یہ ریستوران بگڈ (bugged) ہے۔"

ہم اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھے تو لڑکے نے ہانک لگائی: "بو والی ڈاڑھی سے آٹھ روپے بارہ آنے!" لیکن چچا عبدالباقی خراماں خراماں دروازے پر چلا گیا اور میں نے بِل کی ادائیگی کی۔

"نہایت نامعقول بیرا ہے! کوئی تمیز نہیں،" باہر آ کر چچا نے مجھ سے شکایت کی۔

میں نے حسبِ معمول اس سے اتفاق کیا۔

"ہاں، تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم -- میں اور تم -- گدھے ایکسپورٹ کریں گے، اور اس سے پہلے پہلے کہ کسی اور کو یہ بات سوجھے۔ یہ میمن لوگ بڑے کائیاں ہوتے ہیں--- تین چار مہینے میں بھتیجے بختیار، تم لاکھوں

میں کھیل رہے ہو گے۔ ٹرسٹ انکل عبدالباقی! تم کو اس کالم والے جاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میرا ایک فائن کولونیل ہاؤس وکٹوریا روڈ پر ہو گا۔ اور ایک لمبی شوفر ڈریون بیوک گاڑی۔ تم جانتے ہو میں تم سے فرق نہیں کرتا، تم بھی اسے وقتاًفوقتاً استعمال کر سکتے ہو۔ ابھی میں تمھیں کار خریدنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ برخوردار عبدالرحمٰن ہارورڈ میں پڑھے گا، نہرو اور قائداعظم کی طرح -- وہ جینیئس لڑکا ہے!"

میں نے اسے بتایا کہ قائداعظم نے ہارورڈ میں نہیں پڑھا تھا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

"ہاں تو بھتیجے، گدھے یہ سب کچھ کریں گے۔ گدھے ہمیں عبداللہ ہارون سے زیادہ مالدار سیٹھ بنا دیں گے۔"

"لیکن چچا، گدھے یہ سب کچھ کیسے کریں گے؟ تم سنجیدہ ہو؟" میں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"کیوں، گدھے کیوں نہیں؟ گدھوں نے کیا قصور کیا ہے؟ جب ہر قسم کا الّم غلّم -- بلیاں، کتے، اونٹ، گھوڑے -- ایکسپورٹ ہو سکتے ہیں تو تمھیں گدھے امریکا ایکسپورٹ کرنے پر کیوں اعتراض ہے؟ تم نے سنا نہیں وہ میمن کیا کہہ رہے تھے؟"

مجھے گدھوں کی ایکسپورٹ پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں پہلے بھی باربار بتا چکا ہوں کہ ہم خلجی بعض خاندانی وجوہات کی بنا پر گھوڑوں سے الرجِک ہیں، اور دوسرے نمبر پر بلّیوں سے۔ گدھوں سے ہمیں کوئی پرخاش نہیں۔ وہ پُھرتیلے، چاق و چوبند، ہونہار حیوان ہیں اور صرف اپنے دفاع میں دولتّیاں جھاڑتے ہیں۔

"لیکن چچا، ہمیں ابھی تفصیلات کا علم نہیں۔ یہ خبر میں نے توپ و تفنگ میں نہیں دیکھی--- یہ سب کچھ کیسے ہو گا؟ اور روپے؟ وہ کہاں سے آئیں گے؟"

"روپے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"شروع میں، ایکسپورٹ سے پہلے، ہمیں گدھے خرید کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہو گی۔ گدھے سڑک پر چلتے پھرتے تو حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے مالک ہوتے ہیں جو انھیں اٹھانے نہیں دیتے۔"

چچا نے پہلے اس روپے والے معاملے پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جب اسے اس مشکل سے نبٹنا پڑا تو اسے اس کا حل ڈھونڈنے میں دیر نہ لگی۔

"دیکھو بھتیجے،" اس نے بزرگانہ شفقت سے سمجھایا، "تم نے اپنا فلیٹ پانچ ہزار روپے پگڑی دے کر کرائے پر لیا تھا۔ تم نے خود مجھے یہ کہا۔ ان دنوں کراچی میں بُوم ہے۔ فلیٹ کسی اور کو پگڑی پر دے دو، تمھیں آسانی سے سات آٹھ ہزار، بلکہ دس ہزار پگڑی کی رقم مل جائے گی۔ تم میرے غریب خانے پر آ رہو۔ تم نے وہ آٹھ فٹ بائی آٹھ فٹ کا سرونٹ کوارٹر تو دیکھا ہی ہو گا۔ خالی پڑا ہے۔ تمھاری چچی کو میں سمجھا لوں گا۔ اور پھر اپنے بوڑھے آدمی کو لکھو، پندرہ بیس ہزار روپے تو وہ تمھیں بھیج ہی دے گا۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سارے روپے کا کرے گا کیا؟"

"اولڈ بوائے سے ایک کوڑی کی توقع نہیں،" میں نے کہا۔ "دو مہینے ہوئے میں نے اسے دو ہزار روپے کی معمولی رقم منی آرڈر کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس نے خط لکھا کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے اور اس کا ہاتھ بےحد تنگ ہے۔"

"معاف کرنا بھتیجے،" چچا بولا، "تمھارا اولڈ مین ہے تو میرا دوست مگر اس ادھیڑ عمر میں اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ دوسری شادی! اور اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے دمڑی تک نہیں!"

چچا کے منھ سے پہلی بار اپنی لیاقت کی تعریف سن کر میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ پالتو بلّی کی طرح خرخرانے کو جی چاہنے لگا۔

"اچھا تو بھتیجے، فلیٹ دے دو۔ کیا کہتے ہو؟"

"فلیٹ تو میں ہرگز نہیں دوں گا،" لائق فائق ہونے کے باوجود میں فلیٹ چھوڑ کر چچا کے ہاں شِفٹ ہونے کو تیار نہ تھا۔

"نہیں دو گے فلیٹ؟" ایک انتہائی تکلیف کی کیفیت چچا کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ "اب جبکہ سات آٹھ ہزار کی سرمایہ کاری سے اس سے سو ہزار گنا تمھارے ہاتھ میں آنے لگا ہے؟ بھتیجے، تم سے زیادہ بےوقوف آدمی میں نے کوئی اور نہیں دیکھا--- اچھا خیر، دیکھتے ہیں--- اب صورت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ جب ہم یہاں باتیں کر رہے ہیں، کھارادر کی آدھی میمن آبادی امریکا کو گدھے ایکسپورٹ کرنے کی اسکیمیں

بنا رہی ہو گی۔ ہم کو اس میدان میں پہلا ہونا ہے۔ وہ کیا شعر ہے--- مینا اسی کا ہے؟"

"ہاں، ایسا کوئی شعر سنا تو میں نے بھی ہے۔"

چچا میرے فلیٹ دینے سے انکار کے باوجود اتنا ہشاش بشاش اور پُراعتماد تھا کہ اس کی خوش امیدی کا کچھ حصہ میرے تن بدن میں بھی سرایت کرنے لگا۔

باتیں کرتے کرتے ہم گارڈن روڈ کے ٹرام ٹرمینس پر آ پہنچے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اب گھر جائے گا۔ اس نے کہا کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ لوہے پر اس وقت ضرب لگانے کا ارادہ رکھتا ہے جب کہ وہ تپا ہوا ہے۔ "امریکا کے امپورٹرز کو آج ہی رات کیبل گرام بھیجنا ہوں گے۔ بھتیجے، ہی---ہو!"

"ہی---ہو!"

ہم نے ٹرمینس سے ٹرام پکڑی۔ گڑگڑاتے اور ٹھن ٹھناتے ہوئے ہم بولٹن مارکٹ کو گئے؛ ہمارے دل گاتے ہوئے اور گدھوں کے لیے نیک خواہشات سے پُر۔ اتنے ہائی اِسپرِٹس میں ہم تھے کہ حرکت کرتی ہوئی ٹرام سے اترتے ہوئے ہم پلیٹ فارم پر کچھ دیر حالتِ رقص میں رہے۔ مارکٹ پر اتر کر سامنے کی سائڈ لین سے پہلے ہم "توپ و تفنگ" کے دفتر گئے جو پانچ منٹ کا راستا ہے۔

"میں نے سنا ہے کہ اخبار کا مالک خواجہ اس کریہہ المنظر جیل خانے پر توپیں نصب کرنے کا سوچ رہا ہے۔"

وہاں میں نے اپنا کالم، جو میری جیب میں تھا، سب ایڈیٹر کے حوالے کیا اور اس روز کے اخبار کے پہلے صفحے پر گدھوں والی خبر کی سرخی بھی پڑھی: "امریکا پاکستان سے چالیس ہزار گدھے امپورٹ کرے گا۔" اصل خبر ساتویں صفحے پر ایک پورے کالم میں درج تھی، لیکن اداریے میں گدھوں کا تذکرہ نظر نہ آیا؛ وہ بھارت کی ہٹ دھرمی وغیرہ کے موضوع پر تھا۔ "توپ و تفنگ" سے ہم پیدل روز اسٹریٹ پر اباسین ٹریڈنگ کمپنی پہنچے جو باربر اینڈ باربر ہیئر کٹنگ سیلون کے اوپر ایک پیلے رنگ کا بالاخانہ تھا -- کمپنی کا بورڈ ٹیڑھاترچھا لٹکا ہوا اور درودیوار پر حسرت برستی ہوئی۔ چچا نے ۱۹۴۸ میں اپنے کراچی میں ورود کے فوراً بعد یہ جگہ باربر اینڈ باربر سے

پانچ سو روپے پگڑی دے کر حاصل کی تھی۔ اس نے یہاں دھوم دھام سے اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کا آغاز کیا کیوں‌کہ اُن دنوں ہر کوئی کچھ نہ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ کراچی کو اپنے کاروباری منصوبوں کا صدرمقام چننے کے بعد وہ ایک سال کراچی کینٹ اسٹیشن کے نزدیک کارلٹن ہوٹل میں رہا۔ (اس نے مجھے بتایا کہ وہ ہر شام باقاعدہ ڈنر سیاہ بو اور ڈنر جیکٹ پہن کر ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھایا کرتا تھا۔) اُس وقت چچا کے پاس بہاولپور میں زمینوں کی فروخت سے حاصل شدہ روپے تھے۔ چچا نے اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر کو ٹھاٹ باٹ سے جمایا۔ نیلام گھر سے بہترین فرنیچر خریدا، ایک ہزار کے دو نئے رِمنگٹن ٹائپ رائٹر خرید کیے، اللہ بچایا اکاؤنٹنٹ، مس میسی لیڈی ٹائپسٹ کم سیکرٹری اور ساغر میاں چپراسی پر مشتمل عملہ مناسب مشاہروں پر ملازم رکھا۔ ایک آدھ سال یہ ٹریڈنگ کمپنی وجود میں رہی۔ چچا بلاناغہ دو چار گھنٹوں کے لیے اپنی کھلی چھت کی ویلزلے میں کارلٹن سے اپنی کمپنی میں آتا اور عملے کو ہدایات دیتا، مس میسی کو چار پانچ چٹھیاں ڈِکٹیٹ کراتا اور باربر اینڈ باربر سے شیو کراتا۔ میرا خیال ہے کمپنی نے اس عرصے میں اندرونِ ملک کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار بھی کیا۔ بہاولپور وغیرہ سے درآمد کیے ہوے کھُسّے اور کوری مٹی کے منقّش برتن وغیرہ میں نے خود دفتر میں ایک الماری میں رکھے دیکھے ہیں۔ پھر نامساعد حالات اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے اباسین کا کاروبار ٹھپ ہو گیا اور اللہ بچایا اکاؤنٹنٹ اپنے چار ماہ کے بقایاجات کے عوض تیس چالیس درآمدشدہ کھسّے لے کر چلتا بنا۔ مس میسی نے مجبوراً کہیں اَور ملازمت کر لی۔ مگر اباسین ٹریڈنگ کمپنی اپنے ٹیڑھے بینگے بورڈ کے ساتھ صفحۂ ہستی پر موجود رہی۔ چچا کی زندگی میں آنے کے بعد میں نے اسے کئی بار اس بالاخانے کو پگڑی پر دینے کا مشورہ دیا، مگر چچا نے کہا: "بختیار بھتیجے، ہمارے دوسرے کاروباروں کے لیے بھی اس جگہ کا ہونا ضروری ہے۔ پھر موقع محل کی جگہ ہے اور اگلے سال اس کی پگڑی تیس چالیس ہزار تک ہو جائے گی۔ چھ ہزار تو ابھی سے باربر اینڈ باربر والے مجھے دینے کو تیار ہیں، اور اس کے ساتھ انھوں نے مجھے تاحیات مفت شیو اور بال ترشوائی کا آفر بھی دیا ہے۔"

کاروباری اور دوسری مصلحتوں کے علاوہ چچا کو، میرا خیال ہے، اپنی اس پہلی ٹریڈنگ کمپنی سے ایک جذباتی لگاؤ بھی ضرور ہو گا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار جب بھی چچا بولٹن مارکٹ میں گھر کے لیے صابن تیل کی تھوک خریداری کے لیے آتا تو مجھے "توپ و تفنگ" میں ضرور ملتا اور ہم اباسین کمپنی کی خیرخبر لے آتے کہ آیا وہ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ چوکیدار سے جھاڑو دلواتے، ٹائپ رائٹرز اور الماریوں پر سے گرد صاف کرتے۔ باربر اینڈ باربر بند تھی۔ مگر اباسین کی سیڑھیاں دکان میں سے نہیں بلکہ علیحدہ گلی میں سے اوپر جاتی تھیں۔ ہم نے دروازہ کھولا تو ایک ناگوار سی بُو ہمارے نتھنوں میں آئی۔ لائٹ آن کرنے پر ایک کونے میں ایک بھوری سی بلّی اور چند بلونگڑے نگاہ میں آئے جن کو بظاہر اس دارالفنا میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ بلّی ہمیں دیکھ کر غرّائی؛ اس کے ارادے خیرسگالی کے نہ تھے۔ میں دروازے سے باہر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ چچا عبدالباقی نے تسلّی دی کہ یہ پرانی آفس کیٹ نوشی ہے اور اسے پہچانتی ہے۔ نوشی کس طریقے سے اباسین ٹریڈنگ کمپنی میں بچے دینے کے لیے داخل ہوئی تھی، یہ معمہ چچا اور میں دونوں نہ سلجھا سکے۔ سوائے روشندان کے سب کھڑکیاں بند تھیں۔

"بہرحال یہ اس کی زیادتی ہے کہ اس نے سب جگھوں کو چھوڑ کر اباسین میں بچے دیے ہیں،" چچا عبدالباقی نے کہا، "یہ ہماری، باربر اینڈ باربر اور توکل ٹی ہاؤس کی سانجھی بلّی ہے اور بڑی آسانی سے باربر اینڈ باربر میں بچے دے سکتی تھی۔"

نوشی کی دخل اندازی سے قطع نظر اباسین میں ہر چیز اپنی جگہ پر تھی -- چچا کی میز کے پیچھے چوکھٹے میں قائداعظم کی تصویر، اس سے نیچے ترکی ٹوپی میں چچا کا دس سال پہلے کا پورٹریٹ جس میں وہ کسی ترکی پاشا یا علی برادران کا کوئی دور کا کزن لگتا تھا، میزوں پر غلاف سے ڈھکے رمنگٹن، الماری پر فائلیں اور کوری منقش صراحیوں کے سیمپل (کھسّوں کے نمونے مفرور اکاؤنٹنٹ اللہ بچایا کے پاس تھے۔)

نوشی اور اس کے بلونگڑوں کو نظرانداز کرتے ہوئے چچا نے عادتاً میز پر لگے بٹن کو دبا کر گھنٹی بجائی۔ وہ بھی کام کرتی تھی۔

"بھتیجے، تمھیں ٹائپ کرنا آتا ہے؟" چچا نے اپنی ڈائرکٹر کی سیکنڈ ہینڈ گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر عینک کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوے پوچھا۔

میں نے جواب دیا کہ میں نے بہت سے ٹائپ رائٹر دیکھے ہیں۔

"بھتیجے، ٹائپنگ ضرور آنی چاہیے۔ ٹائپنگ جانے بغیر تم دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اور اس کے ساتھ شارٹ ہینڈ بھی۔ اب اگر تم ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ جانتے ہوتے تو میں تمھیں آفر کے کیبل گرام ڈکٹیٹ کرا دیتا۔ اب یہ مجھے خود ٹائپ کرنا ہوں گے، گو میں کچھ آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔"

چچا کی ایفی شنسی میں کوئی شبہ نہیں۔ اس نے مس میسی کی میز کی دراز سے اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے لیٹرہیڈ، کاربن، اسٹیمپ وغیرہ نکالے، اور ایک موٹی سی کتاب جس میں باہر کی درآمدی برآمدی کمپنیوں کے پتے اور کوائف درج تھے۔ اس نے کاغذ مشین پر رول کیا اور ٹپ ٹپ ایک انگلی سے ٹائپ کرنے لگا۔ اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس نے وقتاًفوقتاً مس میسی کی ہدایات کے تحت ٹائپ سیکھنے سے شوق کیا تھا اور ایک منٹ میں سات الفاظ ٹائپ کرنے کی صلاحیت بہم پہنچا لی تھی -- ایک انگلی سے ٹائپ کرنے میں اس سے بہتر اسپیڈ حاصل نہیں کی جا سکتی۔

میں ایک آنکھ نوشی اور بلونگڑوں پر رکھے اور اپنے نتھنوں کو بند کیے اسے باہر کی فرموں کے نام آفر ٹائپ کرتے دیکھتا رہا۔ آفر کا مضمون جیسے اسے زبانی یاد تھا۔ پھر ٹائپ کرتے کرتے اس کی انگلی اچانک رک گئی۔

"بھتیجے، ایک گدھے کی کیا قیمت ہو گی؟ میرا مطلب ہے ایک اوسط نارمل گدھے کی؟" اس نے پوچھا۔ "عمر چار سے آٹھ نو برس کے درمیان۔"

میں اسے بتایا کہ میں نے زندگی میں بےشمار گدھے دیکھے ہیں مگر تاحال گدھا خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"یہ جنرل نالج اور آئی کیو کا معاملہ ہے۔ پڑھےلکھے آدمیوں کے پاس ہر قسم کی ضروری معلومات ہونی چاہییں۔ اب میں آفر کی کیا پرائس کوٹ کروں؟ ہم انتظار نہیں کر سکتے۔" اس نے اپنا ماتھا ٹھونکا۔ "بھتیجے، تم یوں کرو کہ نیچے سڑک پر جا کر کسی آتےجاتے گدھاگاڑی والے سے کھو کہ تم اس

کا گدھا خریدنا چاہتے ہو اور وہ اسے کتنے میں بیچے گا۔ اس سے ہمیں کم از کم کراچی کے گدھوں کی جنرل قیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

صاف بات یہ ہے کہ میں اس ایرنڈ پر جانے میں متامّل تھا۔ پھر مجھے پانچ برس پہلے کا اسی نوع کا ایک سودا یاد آ گیا۔

"چچا، میرے ایک واقف نے گوجرانوالہ میں ساڑھے آٹھ سو کی ایک دودھیل بھینس خریدی تھی۔ دراصل وہ میرا اپنا ماموں تھا، اس لیے مجھے معلوم ہے۔ اب ایک گدھا بھینس سے تقریباً ایک تہائی وزن کا ہوتا ہے اور بیشتر لوگ اسے خرید کرنے سے ہچکچاتے ہیں، یعنی ڈیمانڈ میں کم ہے۔ اس حساب سے گدھا۔۔۔"

"چلو، تین سو روپے،" چچا نے ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے؟ تم اتفاق کرتے ہو؟ ہم ایک ہزار ایک سو کی آفر دے دیتے ہیں، ایف او بی پرائس۔ فریٹ اور انشورنس امپورٹر دے گا۔"

میں نے موں ریڈ اینڈ کمپنی میں امپورٹ ایکسپورٹ کی ٹرمنالوجی -- ایف او بی، سی آئی ایف وغیرہ -- کے بارے میں کچھ شُدبُد حاصل تو کی تھی مگر ابھی تک ان معاملات پر پوری طرح حاوی نہیں ہو سکا تھا۔

"ٹھیک ہے چچا،" میں نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"یہ کیبل گرام ابھی ابھی جائیں گے -- اسٹرائیک دی آئرن وھائل اٹ از ہاٹ!" چچا نے ٹائپ شدہ کاغذ مجھے تھماتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "کل صبح آٹھ بجے ہم ان کیبلز کے کنفرمیٹری لیٹرز بھی ٹائپ کر کے ان فرموں کو پوسٹ کر دیں گے۔ اب تمھاری سمجھ میں آیا کہ میں نے اس جگہ کو کیوں نہیں دیا؟ اباسین ٹریڈنگ کمپنی زندہ باد! وی ہیو گاٹ گوئنگ!"

"ہا ہا ہا ہا!"

"اور ہاں، تم جانتے ہو مس میسی آج کل کہاں کام کر رہی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے چند روز پہلے اسے میکلوڈ روڈ پر بلیو ہارس کمپنی کے دفتر سے باہر آتے دیکھا ہے۔

"بھتیجے، ہمیں کسی نہ کسی طرح اسے اباسین ٹریڈنگ کمپنی میں واپس لانا ہو گا۔ وہ بڑی ایفی شنٹ ٹائپسٹ سیکرٹری ہے۔ کل ہی اسے کونٹیکٹ کرو۔ ہاں اپنے پاس ایک میمورنڈا ایک رکھو تاکہ اس میں یہ ہدایات

نوٹ کرتے رہو۔ اب ہمیں فُل سوئنگ میں کام کرنا ہو گا کیوں کہ کراچی کی کاروباری مارکٹ میں بڑی بڑی شارک مچھلیاں پڑی ہیں۔ ہم انشاءاللہ ان سب کو ہضم کریں گے۔"

"ہیئر ہیئر ہیئر!" میں نے تالی بجائی۔

"اور سنو، ہمیں دفتر کے لیے ایک چپراسی بھی چاہیے ہو گا۔"

"جیکب لائنز میں میں اپنے ایک دوست کی شادی پر گیا تھا۔ تین چار روز ہوے ہیں اس بات کو۔۔۔"

"بھتیجے، تم مجھے کیوں نہیں لے گئے؟ تمھیں معلوم ہے میں شادیوں پر جانا پسند کرتا ہوں۔" چچا نے شکایت کی۔

"ہاں تو چچا، میں نے وہاں ساغر میاں کو برات کے بینڈ میں دیکھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ وہ تمھارے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے تم سے پچھلے چار مہینوں اور کچھ روز کی تنخواہ وصول کرنی ہے۔"

"بکتا ہے۔ دفتر تو میں نے آفیشلی چھ مہینے سے بند کر رکھا ہے۔۔۔ مگر وہ خود آتا رہتا ہو گا۔ اباسین اس کے لیے ذمےدار کس طرح ہو سکتی ہے؟ ویسے بھی وہ نکمّا باتونی آدمی تھا۔ اب ہم ایک پُھرتیلا تعلیم یافتہ نوجوان رکھیں گے۔ اس کے لیے آنکھ کھلی رکھو۔ اور سنو، آج سے تم اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل مینیجر ہو، ایک تہائی منافعے پر۔ میں برخوردار عبدالرحمٰن کو بھی کمپنی میں مینیجنگ پارٹنر بنانا چاہتا ہوں تاکہ اسے کاروبار کی اونچ نیچ کا تجربہ حاصل ہو جائے۔ بہت ذہین لڑکا ہے۔"

میں نے اسے عبدالرحمٰن کی ذہانت کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع نہیں کیا۔ چچا کافی حساس باپ ہے۔

ہم فولڈر میں کیبل گرام رکھے انھیں ٹیلی گراف آفس لے جانے کے لیے نکلنے کو تھے کہ چچا کو نوشی بلّی کا خیال آ گیا۔

"اب اس نوشی اور اس کے بلونگڑوں کا کیا کریں؟ یہ اس نے نہایت بےہودہ حرکت کی ہے۔ ویسے بھی یہ زیادہ وقت باربر اینڈ باربر میں گزارتی تھی۔ اسے بچے دینے ہی تھے تو وہاں دیتی۔ کل صبح اسے اور بلونگڑوں کو کسی باسکٹ وغیرہ میں ڈال کر باربر اینڈ باربر کے دروازے پر رکھ آنا۔"

"میں؟ تم جانتے ہو میں ان چیزوں سے الرجک ہوں--- اور نوشی ابھی سے غرّا رہی ہے۔"

"خیر، دیکھا جائے گا۔ فی الحال اس کے دودھ کا انتظام کرتے جائیں۔ گیا یاد کرے گی۔ نیچے توکل ٹی ہاؤس سے ساسر میں تھوڑا سا دودھ لے آؤ۔ جلدی کرو۔" چچا بڑا رحم دل آدمی ہے، ان لوگوں میں سے ایک جو ابوہریرہ کی طرح اللہ کی سب چھوٹی بڑی مخلوقات سے محبت کرتے ہیں، خواہ وہ بلیاں ہی کیوں نہ ہوں۔

میں توکل ٹی ہاؤس سے پلیٹ میں آٹھ آنے کا سیربھر دودھ لے آیا۔ چچا نے اسے نوشی کے سامنے رکھ دیا۔ وہ لپ لپ پینے لگی۔ ہم دفتر بند کر رہے تھے کہ دلبر خان پٹھان چوکیدار اوپر چڑھ آیا۔ دلبر خان اباسین، باربر اینڈ باربر، توکل ٹی ہاؤس اور گلی کے آدھے اداروں کا خودمقررکردہ چوکیدار تھا۔

"صائب السلام علیکم۔ کدر چلا گیا تھا؟ ہمارا چھ مہینے کا چوکیداری کا پیسہ دو -- ساٹھ روپیہ بنتا ہے۔"

"خان، تم نے خاک چوکیداری کیا؟ یہ بلّی دفتر میں کیسے گھُسا؟"

"صائب، تمارا دفتر کا بلّی ہے۔ اللہ کا معصوم مخلوق ہے، کوئی شیر چیتا نہیں--- ہمارا پیسہ دو۔"

اس سے جان چھڑانے کے لیے چچا نے مجھے اس کا حساب بےباق کرنے کو کہا۔ میں نے دلبر خان کا حساب چکایا۔ مگر وہ گیا نہیں۔

"کیا بات ہے؟" چچا نے پوچھا۔

"صائب، وہ غریب ساغر میاں اِدر روز تمارا خبر لینے کو آتا ہے۔ اس کا پیسہ بھی ہم کو دو۔"

ہم نے اسے بتایا کہ کل سے دفتر باقاعدہ دوبارہ کھل رہا ہے اور اب اگر ساغر میاں آیا تو خود ہی اپنا بقایا لے لے گا۔

نیچے آ کر ہم نے وکٹوریا پکڑی اور سیدھے ٹیلی گراف آفس پہنچے۔ ایک لمبے کانوں والے کلرک نے، جو ایلس کے وائٹ رَیٹ (White Rat) سے مشابہ تھا، ہم سے کیبل گرام لیے، انھیں دوبارہ سہ بارہ پڑھا اور ہمیں اپنے چشمے کے شیشوں میں سے بغور دیکھا۔ پھر وہ انھیں اپنے ایک اور ساتھی کے پاس دکھانے کے لیے لے کر گیا اور وہ دونوں ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔

وہ لوٹ کر آیا۔

"یہ فارٹی تھاوزنڈ ڈنکیز کیا لکھا ہے؟ ڈنکیز۔۔ یعنی گدھے؟"

"یہ ڈنکیز ڈنکی پمپ ہیں، ایک مشین ہوتی ہے،" چچا نے اسے سمجھایا، "نیچے سے اوپر پانی چڑھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔"

اگر وائٹ ریٹ کو ڈنکی پمپ امریکا برآمد کرنے کے بارے میں کوئی شبہات تھے تو اس نے ان کا اظہار نہیں کیا۔ یہ اس کا کام بھی نہیں تھا۔ اس نے الفاظ گنے اور کہا: "دو سو پانچ روپے۔ ڈبل ریٹ۔"

چچا عبدالباقی نے میری طرف دیکھا اور ہدایت کی: "بھتیجے، دو سو پانچ اسے دے دو۔"

تھوڑی دیر کے لیے میرا دل ڈوبا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری جیب میں چار سو کی رقم بچ رہی تھی۔ ان لاکھوں روپوں کا سوچتے ہوئے جو ہماری سمت بہنے والے تھے، میں نے کلرک کو رقم دے کر رسیدیں لے لیں۔

"بھتیجے، میں نے تم کو رقم دیتے وقت کچھ جھجھکتے دیکھا،" چچا نے ٹیلی گراف آفس سے نکلتے ہوئے کہا۔ "لاکھوں کروڑوں کے بزنس ایسے نہیں ہوتے۔ کل جب یہ دو سو پانچ روپے جو ہم نے اس کلرک کو دیے ہیں ہزار گنا ہو کر ہمارے پاس لوٹ آئیں گے تو تمھاری جیبوں میں ان کو رکھنے کے لیے جگہ نہیں ہو گی۔ ہاں بھتیجے، ایک اور بات۔ گدھے ایکسپورٹ کرنے کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنی چاہیے۔ یہی کامیاب بزنس کا راز ہے۔"

جب میں چچا عبدالباقی کو جمشید روڈ پر اس کے گھر چھوڑ کر اور ہدایات لے کر واپس لوٹا، رات کے بارہ بج رہے تھے۔

صبح ساڑھے نو بجے جب میں خراماں خراماں دفتر یعنی اباسین ٹریڈنگ کمپنی پہنچا، جو میری ویدر کلاک ٹاور سے دس بارہ منٹ کی واک ہے، تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چچا عبدالباقی تاریخی نیلے سوٹ میں، اور اپنی ڈاڑھی کے بغیر، وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اس نے مجھ سے وقت پوچھا، اور جب میں نے گھڑی دیکھ کر کہا: "نو بج کر پانچ منٹ،" تو اس نے مجھے

پوائنٹ آوٹ کیا کہ میں پینتیس منٹ لیٹ ہوں۔

میری غیرحاضری میں وہ بےکار نہیں رہا تھا۔ اس کے بلیوں سے الرجک نہ ہونے کی وجہ سے نوشی کے بلونگڑے ایک ٹوکری میں بحفاظت باربر اینڈ باربر کے تھڑے پر منتقل کیے جا چکے تھے۔ (باربر اینڈ باربر اپنی دُکان دس بجے کھولتے ہیں۔) نوشی کو دودھ پلایا جا چکا تھا اور وہ اپنے بلونگڑوں کے پاس تھی۔ دفتر کی سب کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں جن میں سے تازہ سمندری ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔

"بھتیجے، ایک سگریٹ پلاؤ، اور پھر ہم اپنا کام شروع کریں گے۔"

میں نے تھری کیسلز کا پیکٹ جو میرے پاس تھا اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ دوسروں کے برانڈ کے سگریٹ پینے سے چچا کی ایفی شنسی دوچند ہو جاتی ہے۔

سگریٹ پینے کے بعد اباسین ٹریڈنگ کمپنی پورے زوروشور سے رواں دواں ہو گئی۔ چچا ٹائپ رائٹر پر رات کے مکیل گرامز کے کنفرمیٹری لیٹرز ٹائپ کرنے بیٹھ گیا۔ گزشتہ رات دی گئی پہلی اور ضروری ہدایت کی تعمیل میں مَیں میکلوڈ روڈ پر بلیو ہارس کمپنی کے دفتر چلا گیا جہاں مس میسی اب ٹائپنگ کا کام کرتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چارمنگ طریقے سے مسکرائی اور میں نے کھڑے کھڑے اسے اباسین کے نئے آغاز اور انتہائی روشن مستقبل کی بابت بتایا۔ میں نے واضح کیا کہ اس کی موجودگی اباسین میں بہت ضروری ہے اور اس جیسی ایفی شنٹ ٹائپسٹ کے بغیر اباسین کا بھٹا بیٹھ جانے کا امکان ہے۔ مزید یہ کہ ہم اسے اُس تنخواہ سے ایک دو سو روپے اوپر دیں گے جو بلیو ہارس کمپنی دے رہی ہے۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر مجھے لنچ کے وقفے میں میری ویدر کے سامنے والے ایرانی ریستوراں میں ملنے کو کہا۔ بلیو ہارس والے ملاقاتیوں کا اپنی ٹائپسٹوں سے میل جول پسند نہیں کرتے اور ان کی میزوں کے سامنے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھنے کا بھی وہاں رواج نہیں۔ میں وہاں سے جلد ہی اباسین لوٹ آیا اور چچا کو، جو کنفرمیٹری لیٹرز ٹائپ کر چکنے کے بعد اپنی میز پر بیٹھا میرے تھری کیسلز پی رہا تھا، اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔

"لنچ پر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا،" چچا نے مجھے اطلاع دی۔

میں نے یہ کہہ کر اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ ایک فرم کے مینیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے یوں سستے ریستورانوں میں آنا جانا اور ٹائپسٹ لڑکیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اس کے شایانِ شان نہیں ہو گا۔ پھر مس میسی لنچ کے لیے پے گر رہی ہے اور ایک تیسرے آدمی کے بل کی ادائیگی کا بوجھ اس پر ڈالنا اچھا نہیں لگتا، مگر وہ نہیں مانا۔

سو ہم دونوں ایرانی ریستوران میں لنچ کے لیے جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں مس میسی بھی حسبِ وعدہ اپنا پرس لٹکائے آ گئی۔ لنچ کے دوران چچا اور میں نے اس کے اباسین میں واپس آ جانے کی خاطر اپنی ساری بہلانے پھسلانے کی قوتیں خرچ کیں۔ وہ مسکراتی رہی اور پھر یہ کہہ کر ہمیں حیران کر دیا کہ اس نے میرے جاتے ہی بلیو ہارس کے نام کسی بہانے سے پندرہ دن کی رخصت کی درخواست ٹائپ کی اور اسے منظور بھی کرا لیا۔ اس نے کہا کہ وہ کل سے اباسین میں آ جائے گی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ بلیو ہارس میں زیادہ خوش نہیں اور اس کا جی وہاں نہیں لگ رہا۔

جب ہم یہ معرکہ سر کر کے اباسین لوٹے تو ٹریڈنگ کمپنی کا چپراسی ساغر میاں اپنی بینڈباجے والوں کی میلی اور ڈھیلی وردی میں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ آیا تو تھا اپنے بقایاجات وصول کرنے مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ دوسرا چپراسی رکھنے کے بجائے ساغر میاں ہی یہ فریضہ کیوں نہ انجام دیتا رہے۔ وہ اپنی دوبارہ تعیناتی پر بڑا خوش ہوا۔ میں نے اسے دو تین مہینے کی تنخواہ کی رقم بھی دے دی۔ اسے مختلف مالیتوں کے ڈاک کے ٹکٹ لانے کے لیے جنرل پوسٹ آفس بھیج دیا گیا۔

"ہمارا اسٹاف اب، مکمل ہو گیا ہے،" چچا عبدالباقی نے اپنے گدگدے ہاتھ ملتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"سوائے اکاؤنٹنٹ کے۔"

"سرِدست اکاؤنٹنٹ کا کام تم خود کر سکتے ہو۔ اس میں کچھ خاص بات نہیں۔ سارے اخراجات کا حساب کتاب کسی کاپی میں درج کرتے رہو، اباسین کے اکاؤنٹ میں۔"

پانچ بجے ہم دفتر سے اٹھے۔ مجھ سے اباسین کے اکاؤنٹ میں پچاس روپے اُدھار لینے کے بعد چچا عبدالباقی بس سے گھر لوٹ گیا۔ مجھے

کنفرمیٹری لیٹرز پوسٹ کرنے تھے۔

یہ پہلا دن تھا۔

آنے والے دو تین ہفتوں کے دوران اباسین ٹریڈنگ کمپنی بلاشبہ کراچی بلکہ ملک بھر میں سب سے زیادہ مصروف امپورٹ ایکسپورٹ کی کمپنی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر تم ایفی شنٹ ہونے کا تہیہ کر لو تو پھر تم کو اس سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ساغر میاں چپراسی سے لے کر مس میسی تک ہم سب وقت پر دفتر آتے -- اور چچا عبدالباقی ہر ایک سے پہلے۔ اسے نوشی کو فِیڈ کرنا ہوتا تھا جو اب بلونگڑوں سمیت باربر اینڈ باربر سے توکل ٹی ہاؤس منتقل کر دی گئی تھی جو بلیوں کا لحاظ کرتے تھے۔ آفس کیٹ ہونے کی حیثیت میں نوشی دن میں ایک آدھ بار ہمارے دفتر میں آ نکلتی اور مس میسی کی گود میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاتی -- مجھے مس میسی کا نوشی سے رغبت سے لاڈپیار کرنا اچھا نہ لگتا۔ میسی کے آنے سے اباسین میں جان پڑ گئی تھی۔ لنچ کے وقفے کو چھوڑ کر صبح نو بجے سے پانچ بجے تک ٹائپ رائٹر کی ٹِپ ٹِپ جاری رہتی۔ چچا چٹھیاں ڈکٹیٹ کرانے سے تھکنے کا نام نہ لیتا۔ روزانہ امریکا کی پندرہ بیس امپورٹ فرموں کو کیبل گرام، خط اور ریمائنڈر ٹائپ ہوتے۔ چچا تھری کیسلز پھونکتا کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلتے ہوئے ڈکٹیشن دیتا، جیسے ہمارے کالج کا ایک پروفیسر فانوس اپنا لیکچر دیا کرتا تھا۔ میرے فرائض میں اکاؤنٹنٹ کی میز پر بیٹھ کر ایک رجسٹر میں فرم کا حساب کتاب رکھنا، لنچ کے بلوں، سگریٹوں اور متفرقات کی ادائیگی اور کمپنی کی جنرل دیکھ بھال شامل تھے۔ حساب کتاب ذاتی ہونے کی وجہ سے یہ کوئی زیادہ کام نہ تھا اور مجھے وہاں اپنا کالم لکھنے اور پڑھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ دفتر بند ہونے کے بعد لیٹرز وغیرہ پوسٹ کرنے کا کام بھی میں خود کرتا، کیوں کہ ساغر میاں کو ایسے اہم کام کی ذمےداری نہیں سونپی جا سکتی تھی۔ ساغر میاں کا کام دفتر کے باہر کرسی پر بیٹھنا اور چچا کے گھنٹی بجانے پر اندر آ کر اس کی میز کے پاس کھڑے ہو جانا تھا۔ توکل ٹی ہاؤس میں چائے اور تازہ دم کرنے

والی چیزوں کے آرڈر بھی وہ دے آتا۔ یوں تو دفتر بہ حسن و خوبی اور ایسی سپُر ایفی شنسی سے چل رہا تھا کہ دوسرے اس پر رشک کرتے مگر اکاؤنٹنٹ ہونے کی وجہ سے اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے سرمائے کی صورتِ حال مجھے بعض اوقات پریشان کر دیتی۔ میں ان دنوں اباسین کا واحد فنانسر تھا۔ چوکیدار اور ساغر میاں کے واجبات کے علاوہ مس میسی کی ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ کے پانچ سو میں نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ میرا بینک اکاؤنٹ تیزی سے سکڑتا جا رہا تھا اور مجھے ایک دوست سے تین ہزار روپے اُدھار لینا پڑ گئے۔ اور ہمیں چالیس ہزاو گدھے ابھی فراہم کرنا تھے، یعنی تین سو روپے فی گدھا کے حساب سے تقریباً بارہ لاکھ روپے۔۔۔

انھی دنوں میں نے چچا عبدالباقی سے پوچھا: "چچا، چالیس ہزار گدھے ہم اکٹھے کیسے کریں گے؟ کیا اتنے گدھے مل جائیں گے؟ انھیں میں ٹین کیسے کیا جائے گا؟"

چچا نے مجھے ان نظروں سے دیکھا جن سے عقلمند لوگ احمقوں کو دیکھا کرتے ہیں۔

"بھتیجے، ملک میں سو آدمیوں کے پیچھے ایک گدھا بھی رکھو تو پانچ کروڑ کی آبادی میں پانچ لاکھ گدھے تو ہوں گے ہی -- اوڑ میں مشرقی پاکستان کو چھوڑ رہا ہوں جہاں اباسین کی برانچ کا قیام میرے ذہن میں ہے۔ پھر ہر کنٹریکٹ میں ڈلیوری پیریڈ ہوتا ہے -- چھ ماہ، ایک سال۔ ہم گدھے قسط وار خریدتے جائیں گے اور قسط وار امریکا کی پارٹی کو شِپ کرتے جائیں گے۔ وہ گرِنڈلیز بینک میں کم از کم ایک تہائی رقم کا لیٹر آف کریڈٹ کھولے گی۔ اس رقم سے ہم فوراً گدھوں کی خرید شروع کر دیں گے۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ فکر مت کرو۔"

اسی روز لنچ کے بعد تھری کیسلز پیتے ہوے وہ چونک سا گیا۔

"بھتیجے، ایک ضروری بات تو ہم بھول ہی گئے۔ تم نے بھی مجھے یاد نہیں کرایا۔"

"کون سی ضروری بات چچا؟"

"بیرونِ ملک گدھے ایکسپورٹ کرنے کے لیے ایکسپورٹ پرمٹ درکار ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ تم امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر میں کسی کو جانتے

ہو؟"

میں نے کہا میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔

اس نے اسی وقت مس میسی کو ڈائرکٹر امپورٹ ایکسپورٹ کے نام ایک مفصل چٹھی ڈکٹیٹ کرائی اور مجھے ہدایت دی کہ میں اسی وقت اسے امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر لے کر جاؤں۔ "وہ برنس روڈ پر پیلے رنگ کی بیرکوں میں ہے،" اس نے کہا۔

میں اسے اس لیٹر کو ڈاک سے بھیجنے کی صلاح دینے کو تھا کہ چچا کو ایک برین ویو (brain vawe) آئی۔

"ٹھہرو، بھتیجے، وزیرِ مالیات کون ہے؟"

"ہر کوئی جانتا ہے -- چودھری اللہ دتّا پہلوان۔"

"بھئی وہ تو وزیرِ حیوانی مسائل وغیرہ ہے۔"

"میاں فیض محمد--- وزیرِ مالیات میاں فیض محمد ہے؟" یاد آ جانے پر میں چلایا۔

"ہاہا! بھتیجے، میاں پَھجّا! خدا جانے عبدالباقی اس کو اب یاد ہو گا یا نہیں۔ میں نے شاید کبھی تم سے ذکر کیا ہو کہ علیگڑھ میں میاں پھجّا اور میں اکٹھے یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم میں تھے۔ میں سنٹر فارورڈ تھا اور وہ گول کیپر۔ ہم لنگوٹیے یار تھے۔ ایک بار ہمیں ایک عجب شرارت سوجھی۔ ہم نے ایک اونٹ والے سے بات کر کے رات کے وقت اس کا اونٹ کسی نہ کسی طرح پرو وائس چانسلر اے بی اے حلیم کے بنگلے کے لان میں چھوڑ دیا اور پھاٹک چپکے سے بند کر دیا تاکہ اونٹ باہر نہ نکل سکے۔ پرو وائس چانسلر صبح سیر کے لیے باہر آئے تو اپنے لان میں ایک اونٹ کو پھول پتیوں پر منہ مارتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس بات کا پتا چل گیا کہ یہ میری اور پھجّے کی کارستانی ہے۔ ہم رَسٹی کیٹ ہونے سے بال بال بچے۔ اے بی اے حلیم ڈسپلن کے معاملے میں بڑے سخت گیر تھے، مزاح سے کورے۔ دراصل ہمارے کہنے پر اونٹ والا صبح بنگلے پر گیا اور ان سے کہا کہ اس کا اونٹ اسے واپس کر دیا جائے ورنہ وہ پولیس میں پرچہ درج کرائے گا۔ اور ایک دفعہ---"

اس نے اپنی اور میاں فیض محمد کی مشترکہ شرارتوں کے ایک دو اَور قصّے سنائے جو کافی سیریس تھیں۔ فٹ بال ٹیم میں نہ ہوتے تو دونوں ضرور

رستی کیٹ ہو جاتے جو شاید دونوں کے حق میں مفید ہوتا۔

"چلو بھتیجے، پھجّے کے پاس چلتے ہیں۔"

چچا نے ڈائرکٹر امپورٹ ایکسپورٹ کے نام والی چٹھی کا لفافہ دوسرے اہم کاغذات کے ساتھ بریف کیس میں ڈالا۔ ہم نے نیچے سے وکٹوریا پکڑی اور بونس روڈ پر وزیرِ مالیات کی پتھر کی وسیع کولونیل اسٹائل کی کوٹھی کے سامنے اترے۔ پھاٹک پر کھڑے گارڈ سے ہم نے کہا کہ ہمیں میاں صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے ہمیں وی آئی پی قسم کے لوگ سمجھتے ہوئے اندر جانے دیا۔ کوٹھی کے اُجڑے پُجڑے باغ میں دو بھینسیں چر رہی تھیں۔ باغ کو عبور کر کے جب ہم پورچ کے پاس پہنچے تو ایک بڑے ڈیل ڈول کا قدِآدم کتا ہماری پیشوائی کے لیے بڑھا۔ یہ کافی خوں‌خوار اور آدم خور قسم کا کتا لگتا تھا اور اس کے ارادے ہرگز نیک نہیں تھے۔ ہم خلجی کتوں سے نہیں ڈرتے۔ ایک آزمودہ ٹِپ پر عمل کرتے ہوئے میں نے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ یہ اُن خاموش طبع کتوں میں سے تھا جو غراتے یا بھونکتے نہیں بلکہ مشتبہ افراد کی چیرپھاڑ سے سروکار رکھتے ہیں۔ اور وہ چچا عبدالباقی میں خاص دلچسپی لیتا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے چچا کی ٹانگ سونگھنے کی کوشش شروع ہی کی تھی کہ اتنے میں برآمدے سے وزیر صاحب کے بٹلر نے پنجابی زبان میں کچھ کہہ کر اسے منع کر دیا۔ اس کے استفسار پر چچا نے ہمارے آنے کا مقصد بیان کیا۔ گارڈ کی طرح بٹلر بھی خوش اخلاق تھا۔ اس نے کہا: "میاں صاب تے پی ایم نوں مِلن گیا اے۔ تسیں او دے بھائی صاحباں نوں مل لو۔" ہم میاں فیض محمد کے بھائی صاحبان سے ملاقات کے زیادہ مشتاق نہ تھے مگر بٹلر ہمیں کوٹھی کے اندر ایک اونچی چھت والے ایک بڑے کمرے میں لے گیا جہاں چھت پر لگے بجلی کے پنکھے کے نیچے چار میاں برادران سہ پہر کے قیلولے سے بیدار ہو رہے تھے۔ ہمارے آنے پر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور اس غیرمتوقع آؤبھگت پر ہم سچ مچ حیران رہ گئے۔

"آؤ جی، بسم اللہ بسم اللہ اوئے بٹلرجی، چا بسکٹ لے آ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

میاں برادران پیڑوں کی لسّی اور سنگھاڑے والے کڑھے ہوئے دودھ پر

پَلے ہوئے صحت مند اور خوش مزاج نوجوان تھے، زندہ دلانِ لاہور کے مکمل نمائندے۔ انھوں نے چچا عبدالباقی کی وضع قطع سے اسے کوئی بہت اہم ہستی سمجھا، شاید ترکی کا سفیر وغیرہ، اور مجھے غالباً اس کا سیکرٹری۔

"آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی،" چچا نے کہا، "میرا نام ایچ اے باقی، ایم اے (علیگ) ہے، اور یہ میرے سیکرٹری ہیں مسٹر بختیار خلجی، بی اے۔"

ان میں سے ایک نے اپنا اور دوسروں کا تعارف کرایا: "میرا نام میاں محمد اسلم ہے۔ میں میاں صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں۔ یہ فقیر محمد ہے، ہمارا پھوپھی زاد بھائی۔ یہ میاں طالع محمد ہے، میرا سالا۔ اور یہ برکت علی حسرت ہے، ہمارا ماموں زاد بھائی۔ یہ شعرشاعری کرتا ہے۔"

"چائے کا تکلّف نہ کریں۔ ہم میاں صاحب سے ملنے آئے تھے۔۔۔"

"بیٹھو بادشاہو، میاں صاحب ابھی آ جائیں گے۔" میاں محمد اسلم نے بٹلر کو آواز دی، "اوئے کاکے، میاں صاحب کتّھے گئے نیں؟"

مگر یہ دیکھ کر کہ ہم نے انھیں ڈسٹرب کر دیا ہے، ہم تعارف کے بعد وہاں ٹھہرے نہیں۔ چچا نے اپنا وِزٹنگ کارڈ میاں اسلم کو دیا اور اگلے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے آنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

وہ پورچ تک ہمیں رخصت کرنے آئے، اور یہ دیکھ کر انھیں اچنبھا ہوا ہو گا کہ وہاں ہمیں لے جانے کے لیے کوئی شوفر ڈریون کار نہ تھی۔ کتا اپنے اگلے پنجوں پر سر ڈالے لیٹا تھا اور اس بار اس نے ہمیں یکسر نظرانداز کیا۔

اگلے دن کوئی دس بجے چچا عبدالباقی، اسمارٹ اور چھیل چھبیلا، ایک موٹا ہاوانا سگار منھ میں لیے ناچتے ہوئے قدموں سے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور باچھیں ایلس اِن ونڈرلینڈ کے بلّے کی طرح چِری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے پرانے دوست میاں فیض محمد سے مل آیا تھا (جس نے اسے سگار دیا تھا)۔ اس نے آتے ہی منسٹر کی خوش اخلاقی، دوست نوازی، شیریں کلامی وغیرہ کی اتنی لمبی چوڑی تعریفیں شروع کر دیں کہ میاں پھجّا اگر وہاں ہوتا تو غبارے کی طرح پُھول کر پھٹ جاتا۔

"منسٹر نے کہا کیا؟ کیا ایکسپورٹ پرمٹ کا کام ہو گیا؟" میں نے اسے ٹوک کر پوچھا۔

"بختیار، بڑا چارمنگ آدمی ہے میاں فیض محمد،" وہ بولا۔ "مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور بھینچ بھینچ کر گلے ملا۔ کہنے لگا، آؤ عبدالباقی یار، تم یہاں کہاں، وغیرہ وغیرہ۔ خوب گپ شپ رہی۔ علیگڑھ کی باتیں اور شرارتیں یاد کیں۔ چلتے ہوئے اس نے ہاوانا سگاز کا ڈبّا مجھے دیا۔ میرے بریف کیس میں ہے۔ تم اس میں سے ایک سگار لے سکتے ہو۔"

"اور ایکسپورٹ پرمٹ؟"

"اس نے میرے سامنے ڈائرکٹر امپورٹ ایکسپورٹ کو فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ یہ کام ایک دو دن میں ہو جانا چاہیے۔ لیٹر اس نے اپنے پی اے کو دے دیا کہ اسے خود ڈائرکٹر کے پاس لے جائے۔ مجھے اس کو بتانا پڑا کہ پرمٹ گدھوں کی ایکسپورٹ کے لیے ہے۔ وہ اس پر خوب ہنسا۔ کہنے لگا، یار تجھے ایکسپورٹ کرنے کے لیے گدھے ہی ملے تھے؟ اس نے کہا کہ شاید امریکا والوں کو گدھے اپنے ملک کی آبادی بڑھانے کے لیے چاہییں۔"

"اس نے اسے مذاق نہیں خیال کیا؟"

"اس کے خیال میں گدھے ان کی پوستیں اور کھال کے لیے چاہیے ہوں گے، جوتے، سوٹ کیس وغیرہ بنانے کے لیے--- ہاں، ایک خرابی ہو گئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میاں پھجّا چاہتا ہے کہ ہم اس کے پھوپھی زاد بھائی میاں فقیر محمد کو اپنے بزنس میں پارٹنر بنا لیں جو بیس پچیس ہزار روپے لگائے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ تین پارٹنر پہلے سے ہیں جن میں سے ہر ایک نے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ لگایا ہے۔ اس نے کہا، چلو چوتھا بھی سہی، کوئی ہرج نہیں۔ بھتیجے، ہم میں سے ہر ایک کا منافع اب ایک تہائی کے بجائے ایک چوتھائی ہو جائے گا۔"

مجھے منافعے کے گھٹنے کی فکر نہ تھی، اور میں نے پوچھا:

"یہ بیس پچیس ہزار روپیہ کب تک کمپنی کی تحویل میں آ جائے گا؟"

"جلد ہی۔ ہاں، ہمیں کسی وکیل سے بات کر کے میاں فقیر محمد کے ساتھ باقاعدہ ڈیڈ رجسٹر کرانا پڑے گی۔ میرا خیال نہیں کہ ڈیڈ رجسٹر ہوئے بغیر میاں پھجّے کا بھائی رقم دے گا۔ ویسے تو اسے ہم جیسے معزز

لوگوں کو ٹرسٹ کرنا چاہیے۔ اے جنٹل مینز ورڈ اِز ایز گڈ ایز اے ڈِیڈ۔"
"چچا، تم خود وکیل ہو۔ ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی لکھتے ہو۔"
"بھتیجے، میں آؤٹ آف پریکٹس ہونے کی وجہ سے بھول گیا ہوں کہ یہ چیزیں کس طرح کی جاتی ہیں۔ مگر میرا ایک پرانا دوست وکیل ہے جو بغیر چارجز کے ڈیڈ تیار بھی کرا دے گا اور اسے رجسٹر بھی۔ اباسین ٹریڈنگ کمپنی کو بھی میں نے اُسی کے ذریعے رجسٹر کرایا تھا۔"
یہ میرے لیے ایک خبر تھی۔ مجھے علم نہ تھا کہ اباسین قانونی طور پر رجسٹرڈ کاروباری ادارہ ہے۔
"چچا، میں ایک اور سگار لے سکتا ہوں؟"
"اور وہ پہلا والا تم نے اتنی جلدی پھونک ڈالا؟ بھتیجے، یہ خاص تقریبات کے لیے ہوتے ہیں۔ انہیں ضائع مت کرو۔۔۔ اچھا، چلو ایک مجھے بھی دے ہی دو۔"
ہم ہاوانا سگار پھونکنے لگے۔ بیس پچیس ہزار روپے ہمیں جلد ہی ملنے والے تھے۔ میں نے اپنے جنرل نالج میں اضافے کی خاطر پوچھا:
"چچا، یہ ہاوانا کہاں ہے؟"
"بہت دور۔ افریقا کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے۔"
"وہ تو زنجبار ہے۔"
"کیوبا کا دارالخلافہ ہے،" مس میسی نے مسکرا کر کہا، "اور کیوبا امریکا کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے۔"
چچا نے اُس روز کوئی ڈکٹیشن نہیں دی ۔۔ یہ سگار پینے کا دن تھا۔

آنے والے چار پانچ دن اباسین کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور جنرل مینیجر کے لیے بھاگ دوڑ اور مصروفیت کے دن تھے۔ ہم نے میریٹ روڈ پر سمال کاز کورٹ کے باہر ایک دڑبے میں مقیم چچا کے دوست مقرّب علی عقرب ایڈووکیٹ کو پکڑا۔ ڈِیڈ چچا کی ہدایت کے بموجب اس طرح تیار کرائی گئی کہ سب کچھ مینیجنگ ڈائرکٹر کے ہاتھ میں رہے اور بعد میں اگر پارٹنرز اپنا سرمایہ نکال کر الگ ہونا چاہیں تو نہ ہو سکیں۔ رجسٹریشن کے دن چچا

گھر سے اپنے ہونہار بیٹے عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر دفتر پہنچا اور ہم کشاں کشاں وکٹوریا میں بونس روڈ پر چوتھے پارٹنر میاں فقیر محمد کو دبوچنے گئے۔ اس نے پچیس ہزار روپے اسی روز بذریعہ چیک میکلوڈ روڈ پر حبیب بینک میں اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے اور سب پارٹیوں کی موجودگی میں رجسٹرار کے دفتر میں ڈیڈ کی رجسٹریشن بھی اسی روز ہو گئی۔ عقرب ایڈووکیٹ، جس کی بکرڈاڑھی تھی، کافی ترت پھرت والا اور چرب زبان تھا اور ہمیں رجسٹری کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ رجسٹری کے اخراجات میاں فقیر محمد نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ ادا کر دیے۔

سرمائے کے آ جانے سے اب اباسین ٹریڈنگ کمپنی کی مالی پوزیشن کچھ مدّت کے لیے ساؤنڈ ہو گئی۔ چچا کی ایفی شنسی اور سوجھ بوجھ میں کوئی شک نہ تھا۔ دوسرے ہی روز اس نے چار ہزار کا چیک کاٹا اور اسے بُھنانے خود بینک میں گیا۔ جب وہ رقم جیب میں لیے لوٹا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ بھول گیا ہے کہ دو ہزار سے اوپر کی رقم اب تک جنرل مینیجر کی اپنی جیب سے خرچ ہو چکی ہے اور اس کا حساب بےباق کیا جانا ہے۔ میں نے اس کی یاددہانی کی غرض سے حساب کتاب کی کاپی اس کے سامنے رکھی تو اس نے کچھ غوروفکر کے بعد ایک ہزار کی رقم مجھے دے دی اور ہدایت کی کہ ابھی ہمیں خرچ کرنے میں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔

لیکن سرمائے کے آ جانے کے بعد بھی اباسین کی کاروباری پوزیشن میں کوئی خاص بہتری پیدا نہ ہو سکی -- ماسوا اس کے کہ چچا عبدالباقی اب ہفتے میں تین چار بار بس کے بجائے وکٹوریا میں دفتر آنے لگا۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ ڈھائی تین ہزار کی ایک اچھی سیکنڈہینڈ کار خریدنے کا سوچ رہا ہے۔ اباسین کی تشکیلِ نو کے بعد ایک سو دس کے لگ بھگ کیبل گرام اور میمورینڈم امریکا کی فرموں کو بھیجے جا چکے تھے، مگر وہاں کے امپورٹر غالباً اپنے دفتروں کو تالا لگا کر ہوائی یا فرنچ ریویرا کی سیروں پر نکلے ہوئے تھے۔ چچا کا خیال تھا کہ ڈاک خانے والے گڑبڑ کر رہے ہیں اور اباسین کی ڈاک کو دبا لیتے ہیں۔ اس نے اس سلسلے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے نام ایک چٹھی بھی ڈکٹیٹ کرائی۔ تین چار جواب جو ہمیں

موصول ہوئے غیرتسلی بخش اور کسی قدر اوٹ پٹانگ تھے۔ ایک فرم نے جواب دیا کہ ہم کتنی مدّت میں آ رہے ہیں اور کس اسٹیم شپ سے۔ (ہمارے لیے یہ جواب معمّہ بنا رہا۔) ایک اَور فرم اینڈریو بیسٹ ہیڈ برادرز نے لکھا کہ ان کو فی الحال گدھوں کی ضرورت نہیں، البتہ اگر ہم انھیں ان کی اور ان کے ساتھ ہاتھیوں، اونٹوں اور مگرمچھوں کی پوستینوں کی کوٹیشنز (ایف او بی اور سی آئی ایف) بھیج سکیں تو وہ شکرگزار ہوں گے۔ ڈینس میڈمین جونیر نے تو ہماری آفر کے جواب میں الٹا ہمیں آسٹریلیا کے کنگرووں کی آفر بھیج دی۔ (قیمتیں معقول تھیں، لیکن ہم کنگرووں کا کیا کرتے!) ایک اَور فرم نے، جسے ہم نے چار پانچ ارجنٹ ریمائنڈر بھیجے تھے، ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے مزید ان کا وقت ضائع کیا تو وہ حکومتِ پاکستان سے ہماری شکایت کریں گے۔

چچا عبدالباقی کا ڈکٹیشن دینے کا جوش وخروش بھی کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا کیوںکہ امپورٹرز کے پتوں کی کتاب میں درج ہر معقول امپورٹر کو میمو اور ریمائنڈر بھیجے جا چکے تھے۔ ہم بیشتر وقت آمنے سامنے بیٹھے تھری کیسلز پھونکتے اور اباسین کی مالی پوزیشن پر بحثیں وغیرہ کیا کرتے۔ چچا اب بھی پُرامید تھا اور اباسین کے سب پارٹنرز کی میٹنگ بلانا چاہتا تھا جس میں مینیجنگ ڈائرکٹر کی تنخواہ اور الاؤنسز وغیرہ کا فیصلہ کیا جائے۔ اس نے کہا کہ وہ زیادہ عرصے معقول تنخواہ کے بغیر کام نہیں کرے گا۔

مس میسی کے پاس بھی اب کام نہ رہا تھا۔ وہ اب پرس سے نیل پالش نکال کر اپنے ناخنوں کو پینٹ کرتی اور جمائیاں لیتی رہتی۔ ہم نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا دل اباسین ٹریڈنگ کمپنی سے اُچاٹ ہو رہا ہے۔ ہم اسے حتی الامکان انٹرٹین کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ مجھے ایک کھیل آتا تھا جس میں مربعے بنا کر ان میں جہازوں اور آبدوزوں کی پوزیشن مارک کی جاتی ہے اور فریقین ایک دوسرے کے جہازوں اور آبدوزوں کو نمبر بوجھ کر ڈبونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ کھیل ہے اور اس میں وقت اچھا گزرتا ہے۔ اکثر وہ پڑھنے کے لیے کوئی ہارر ناول، کاؤنٹ ڈریکولا وغیرہ، لے آتی اور اس کا پلاٹ ہمیں سنایا کرتی۔ ساغر میاں اب باہر کرسی پر بیٹھنے کے بجائے زیادہ وقت دفتر میں گزارتا اور ہمیں بجنور میں اپنے ماموں کے آم

کے باغوں اور اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر شیر کے شکار کے قصّے سناتا۔ وہ ایک والٹر مِٹی (Walter Mitty) دنیا میں رہتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور مجھے اپنی غزلیں "توپ و تفنگ" میں چھپوانے کے لیے پیش کرتا رہتا۔

جو ایک اَور مہینا اسی طرح گزر گیا تو چچا سچ مچ فکرمند ہونے لگا۔ ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہ سکتے تھے؟ میاں فقیرے کے پچیس ہزار تیزی سے گھٹتے چلے جا رہے تھے۔ چچا کا جب جی چاہتا چیک کیش کرا لیتا۔ کمپنی کے اکاؤنٹس عجیب گڈمڈ حالت میں تھے۔ آخر چچا نے فیصلہ کیا کہ معاملے کو مزید صیغۂ راز میں نہیں رکھا جا سکتا اور ہمیں ظہیر شارک اور فرید شارپر سے مشورہ کرنا چاہیے۔

"دونوں میری بڑی قدر کرتے ہیں،" اس نے مجھے بتایا، "مگر میں خوددار آدمی ہوں اس لیے ان سے زیادہ نہیں ملتا جلتا۔ ظہیر شارک میرے والد کے ایک ڈاکٹر دوست کا کمپاؤنڈر تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس نے نوکری پر لات مار دی اور یہاں آ کر کپاس کی ایکسپورٹ میں لاکھوں کمائے۔ فرید شارپر اسکول میں میرا کلاس فیلو تھا۔ کسی فرید چڑیاکوٹی کی غزلیں لاہور اور دہلی کے رسالوں میں چھپتی تھیں۔ یہ ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ یہ اس کی غزلیں ہیں۔ ان کے بل پر مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوتا۔ بعد میں وہ بمبئی جا کر کسی فلم کمپنی کا پبلسٹی افسر وغیرہ ہو گیا۔ تقسیم کے بعد یہاں چلا آیا اور چند ہی مہینوں میں کراچی کے بڑے امپورٹروں ایکسپورٹروں میں شمار ہونے لگا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس میں اتنے برینز ہیں۔ بالکل ہونّق سا ہوا کرتا تھا۔ سنا ہے امریکا میں پاکستان کے سفیر ایچ بی طہرانی سے، جو گورنمنٹ سے تنخواہ نہیں لیتا، اس کا کافی گٹھ جوڑ ہے۔ طہرانی کا کپاس، چمڑے، جُوٹ اور الّم غلّم کا سارا کاروبار فرید شارپر لمیٹڈ امپورٹر ایکسپورٹر کے ذریعے ہوتا ہے۔ بلکہ فرید شارپر لمیٹڈ ہے ہی طہرانی کی کمپنی۔۔۔"

چناں چہ ایک صبح چچا اور میں نے ضروری کاغذات اور لیٹرز وغیرہ کی فائلیں اپنے بریف کیسوں میں رکھیں، اپنی ٹائیوں کو درست کیا اور پہلے شارک ٹریڈرز کے دفتر کی راہ لی جو میکلوڈ روڈ پر سِٹی ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک خستہ، آڑی بینگی دومنزلہ عمارت تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں

چڑھ کر (نیچے غالباً کوئی گودام تھا) ہم اوپر ایک شہتیروں کی چھت والے بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ ظہیر شارک کرتے پاجامے میں ملبوس کمرے کے ایک کونے میں چاندنی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، ان بونے سے گدگدے آدمیوں میں سے ایک جو اپنے کو آسانی سے تہہ کر لیتے ہیں اور جن کا طول اور عرض یکساں ہوتا ہے۔ دو اور آدمی، زرق برق ڈاڑھی والا اکاؤنٹنٹ اور دبلاپتلا مرد ٹائپسٹ میز کرسیوں پر بیٹھے اپنے کام میں مصروف تھے کیوں‌کہ فرش پر بیٹھ کر لکھنے اور ٹائپ کرنے کا کام آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ شارک مجھے داستانوں کے سوداگر بچوں کی طرح لگا۔ وہ اٹھ کر بےحد مؤدبانہ تپاک سے چچا عبدالباقی سے ملا۔

"سر، آج چاند کہاں سے طلوع ہو گیا؟ جناب کی بڑی کرم فرمائی ہے کہ خادم کو مدت کے بعد زیارت کی عزت بخشی۔ کرسیاں منگواؤں؟" لکھ پتی ہونے کے باوجود وہ اب بھی چچا کے والد کے ڈاکٹر دوست کا کمپاؤنڈر تھا۔

ہم پھسکڑا مار کر اس کے پاس چاندنی پر بیٹھ گئے اور دو بوسیدہ گاؤتکیوں سے ٹیک لگا لی۔

"ظہیر، کاروبار کیسا ہے؟" چچا نے پوچھا۔

"سر، آپ کی دعاؤں سے اللہ کا فضل ہے۔ چائے پیش کروں؟ اوئے بچے---"

"ہم چائے نہیں پییں گے،" چچا عبدالباقی نے خلافِ توقع چائے پینے سے انکار کیا۔ دراصل ہم فرش پر زیادہ آرام سے نہ تھے اور چچا کو اپنی کسی ہوئی پتلون کے پھٹنے کی فکر بھی ہو گی۔ "دراصل ہم ایک ضروری کام سے آئے ہیں۔ ہمارا مسئلہ حل کر دو۔"

"سر، بسروچشم۔ فرمائیں۔"

چچا نے گدھے ایکسپورٹ کرنے کے پلان کا سارا قصہ سنایا کیوں‌کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

"سر، گدھے؟" ظہیر شارک نے مسکرائے بغیر مؤدبانہ پوچھا۔

ہم نے اخباروں کے تراشے اور ایکسپورٹ پرمٹ، جو چچا کی میاں فیض محمد سے ملاقات کے تیسرے روز ہمیں مل گیا تھا، اسے دکھائے اور اگر وہ پہلے اس ساری اسکیم کو مذاق خیال کرتا تھا تو اب اسے جینونِ جانتے ہوئے

اس میں دلچسپی لینے لگا۔

"پھر سر، آپ نے آفرز بھیجیں؟"

"بیسیوں--- سینکڑوں- مگر امریکا کے امپورٹرز کو سانپ سونگھ گیا ہے- وہ ہمارے ساتھ کوآپریٹ نہیں کر رہے- تم سیانے آدمی ہو- بتاؤ کیا کیا جائے۔"

ہم نے باہمی دلچسپی کے اس مسئلے پر مزید گفتگو کی- گفتگو کے دوران چچا نے وہ بھاؤ بھی بتائے جو ہم نے کوٹ کیے تھے، اور شارک نے کہا کہ اس کے خیال میں یہ بہت کم ہیں اور گدھا آج کل سات آٹھ سو سے کم میں نہیں آتا۔

"ماما جی،" اس نے زرق برق ڈاڑھی والے کو مخاطب کیا جو دراصل اس کا ماموں تھا، "آج کل گدھا کتنے میں آ جاتا ہے؟"

"نو سو سے کم میں نہیں،" ماموں نے ڈاڑھی کو مٹھی میں لیتے ہوئے کہا۔

معلوم ہوا کہ شارک ٹریڈرز نے ڈیڑھ ماہ پہلے دو گدھاگاڑیاں مع گدھوں کے خریدی تھیں جن پر مجموعی لاگت پونے تین ہزار آئی تھی- چچا نے مجھے کچھ ناراضگی سے دیکھا جیسے کم کوٹیشن میرا قصور ہو- لیکن ظہیر شارک اب اس اسکیم کے بارے میں ہم سے بھی زیادہ سرگرم ہو گیا تھا۔

"خیر، آفرز ریوائز بھی ہو سکتی ہیں- اور جہاں تک گدھوں کی فراہمی کا تعلّق ہے ہمیں سرِدست فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں- بہاولپور میں ہمارے آدمی ہیں جو آرڈر آ جانے پر گاؤں گاؤں جا کر گدھے خرید لیں گے اور انہیں ٹرکوں یا مال گاڑی میں لاد کر پہنچا دیں گے۔"

گفتگو میں یہ بھی کھلا کہ شارک ٹریڈرز نے ملیر سے دو میل آگے پچاس ایکڑ کا ایک ٹکڑا خریدا ہے جس پر پپیتوں کا باغ کاشت ہو گا- وہاں پانی پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی نہر کی کھدائی ٹھیکے پر ہو رہی ہے اور کوئی دو سو گدھے مٹی کی ڈھوائی میں مصروف ہیں۔

"مطلب یہ ہوا کہ دو سو گدھے ان ہینڈ ہیں؟"

"سر، یہی سمجھیں-" ظہیر شارک ابھی سے خود کو ہمارا پانچواں پارٹنر سمجھے ہوئے تھا- "بس آرڈر کی دیر ہے۔"

کچھ مزید بحث کے بعد ہم نے ظہیر شارک کی معیت میں فرید شارپر لمیٹڈ کا رخ کیا جو شارک ٹریڈرز سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر میاں معمارالدین ایم این اے کے اخبار "ہنوز" کے دفتر سے ملی ہوئی عمارت میں متمکن تھے۔ شو روم میں کھڑی دو نئی لنکاسٹر موٹرگاڑیوں، ایک ٹریکٹر، دوسری مشینری اور دو حسین و جمیل اینگلوانڈین ٹائپسٹوں کی میزوں کے درمیان سے اپنا راستا دریافت کرتے ہوئے ہم نے اس کے آفس کیبن پر ایک طرح سے ہلّا بول دیا۔ فرید شارپر اپنی گھومنے والی مخملی کرسی میں نیم دراز، ایک پیپر کٹر سے کھیلتے ہوئے، ایک بھرے بھرے بدن والی حقیقتاً ستم پیشہ اینگلوانڈین ٹائپسٹ کو ڈکٹیشن دینا ختم کر رہا تھا۔

"---تھینکنگ یو---" ہمارے دھاوے پر وہ ایک لحظے کے لیے ہڑبڑا سا گیا۔ پھر چچا کو دیکھ کر جیک اِن دی باکس کی طرح اچھلا اور میز کے اِس طرف آ گیا۔

"آ، او میرے چاچے! ہو ہو ہو ہو! تو کہاں؟"

وہ اس وارفتگی سے گلے بلکہ پیٹ ملے جیسے برسوں کے بچھڑے عاشق ہوں۔ ظہیر اور مجھ سے اس نے فقط ہاتھ ملایا۔ اپنی گھومنے والی کرسی پر دوبارہ جا بیٹھنے کے بعد اس نے چچا سے پرانے گِلے شکوے کیے۔

"دیکھ چاچے، تیرے لیے انگلینڈ سے نئی لنکاسٹر گاڑی امپورٹ کی ہے۔ فائیو گیئر، فلوئِڈ ٹرانسمیشن ڈرائیو۔ قیمت صرف تیرے لیے سات ہزار روپے۔ مفت ہے۔ لے جا۔ عیش کر۔"

"میں پُوژو خریدنے کا سوچ رہا ہوں،" چچا نے اعلان کیا۔ "مجھے انگلش کاریں پسند نہیں۔"

"اوئے چاچے، پچھتاؤ گے۔ فلوئڈ ٹرانسمیشن ڈرائیو ہے، ڈاج کمپنی کی۔ آرڈر بک کروں؟" اور اس نے بزر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کل بتاؤں گا، ٹرائی کرنے کے بعد۔"

"کل تک تو بِک جائے گی۔ دس منگوائی تھیں۔ تین دن میں آٹھ بِک گئیں۔ میجر پنگل کو بلاتا ہوں، تمھیں ٹرائی کرا دے گا۔ پنگل کمپنی کا کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ ہے۔"

ہم نے اٹھی ہوئی مونچھوں سے ایک متوسط قد کے آدمی کو باہر پنجوں

کے بل چلتے ہوے دیکھا۔ یہ پنکل تھا۔

"کل؟"

فرید شارپر کے چہرے پر پھیلی ہوئی کاروباری مسکراہٹ بجھ سی گئی۔ اسے شاید چچا کے کارلٹن ہوٹل کے ایام سے یہ گمان تھا کہ اس کے پاس روپے کی ریل پیل ہے۔

"تیری مرضی۔ اچھا، یہ بتا، کافی یا ٹھنڈا؟"

کافی کا حکم صادر کرنے کے بعد اس نے پھر لنکاسٹر کار کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔

میں نے فرید شارپر کو پہلی ہی نظر میں ناپسند کیا۔ اور ہم خلجی جب کسی کو ناپسند کرتے ہیں تو وہ ناپسندیدگی مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ فرید شارپر تھری پیس سوٹ میں ان لوگوں میں سے تھا جنھیں دوہرے بدن والا کہا جاتا ہے۔ اس کی بوٹی بوٹی سے فارغ البالی اور خوداعتمادی ٹپکتی تھی۔ اسے غور سے دیکھ کر مجھے وہ تھاروبریڈ گھوڑے یاد آئے جنھیں پہلی جنگِ عظیم میں توپوں کے آگے جوتنے کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ ایک تھاروبریڈ گھوڑا تھا۔

"ظہیر صاحب، آپ بھی یہ لنکاسٹر ضرور لیں۔ فلوئڈ ٹرانسمیشن، گیئرلیس ڈرائیو۔ گیئر تبدل نہیں کرنے پڑتے۔" فرید شارپر کے سر پر لنکاسٹر سوار تھی۔

پھر اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوے چچا سے پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا تعارف تو چاچے تُو نے کرایا ہی نہیں۔"

"یہ اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل مینیجر ڈاکٹر بختیار خلجی ہیں،" چچا نے مجھے آنکھ ماری، "توپ و تفنگ میں ان کا کالم دیکھتا چلا گیا ہر ہفتے چھپتا ہے۔"

"ہاں۔ بڑا پُرلطف ہوتا ہے۔ ویسے ہم امپورٹ ایکسپورٹ کے ساتھ پبلشنگ کا کام بھی شروع کر رہے ہیں۔ شارپر پبلشرز پاکستان کی تمام موجودہ سرکردہ ہستیوں پر سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات کی کتابیں مشہور ادیبوں سے لکھوا رہے ہیں۔ سب سے پہلے شارپر پبلشرز میری اسکول کے زمانے کی لکھی ہوئی غزلوں کی کلیات شائع کریں گے۔ کتابت

وغیرہ ہو چکی ہے۔ دیباچہ امریکا میں پاکستان کے سفیر جناب طہرانی د ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ چچا اصل کام کو بھول کر کافی اور کریم رولز میں منہمک ہو گیا تھا۔ لیکن ان سے فارغ ہوتے ہی اس نے گدھوں کی ایکسپورٹ کا قصّہ چھیڑا۔ پہلے تو فرید شارپر نے اسے مذاق سمجھا مگر جب ہم نے اسے اخباروں کے تراشے وغیرہ دکھائے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"تو چاچے، کیا بات ہے؟ آفرز کے جواب نہیں آ رہے؟"

"یہی بات ہے---"

"دیکھو میں کیبل اور ٹیلی فون سے نیویارک اور دوسری جگہوں پر کونٹیکٹ کرتا ہوں۔ بہت تھوڑی فرمز ہیں جو لائیوسٹاک کا دھندا کرتی ہیں۔ آپ لوگوں نے آفر کیا کی ہے؟"

"ہم اسے ریوائز کر رہے ہیں۔ ہماری آفر پاکستانی کرنسی میں اوسطاً دو ہزار روپے ایف او بی ہے۔ مارکیٹ میں ہمارے جنرل مینیجر نے معلوم کیا تھا کہ مقامی گدھے ڈھائی تین سو تک میں بخوبی دستیاب ہیں۔ اب ظہیر صاحب کے اکاؤنٹنٹ صاحب کہتے ہیں کہ گدھا نو سو سے کم میں نہیں ملے گا۔"

"قیمت کے لیے مارکیٹ ریسرچ کرنی ہو گی۔ ویسے ظہیر صاحب کے اکاؤنٹنٹ کا بتایا ہوا ریٹ درست معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر کراچی کے گدھے مائیکرو قسم کے گدھے ہیں، دبلے اور پستہ قد۔ ہمیں آپ کنٹری---"

"مگر یہ بہت چاق و چوبند اور پھرتیلے ہیں،" چچا عبدالباقی نے فرید شارپر کے پانچ سو پچپن کے ڈبّے سے سگریٹ نکال کر مجھے اس کو سلگانے کی ہدایت کی۔ کریم رولز کی پلیٹ صاف تھی۔

"یہاں کی مارکیٹ قیمت کا تو پتا لگایا جا سکتا ہے۔ میں انکوائر کروں گا۔" فرید شارپر نے پانچ سو پچپن کا ڈبّا میری طرف بھی بڑھایا کیوں کہ چچا کو اس کا خیال نہ آیا تھا۔ "ہمارے مینیجر مرزا بشارت بیگ صاحب ایسے کاموں میں چاقو کی طرح تیز ہیں۔ وہ ریٹ وغیرہ صحیح معلوم کر لیں گے۔ انشورنس، فریٹ وغیرہ کے چارجز بھی ٹھیک ٹھیک ورک آؤٹ کرنے ہوں گے۔

ہمارے پاس سب ڈیٹا وغیرہ ہیں۔ آفر ہم اپنی کمپنی کی جانب سے دیں گے۔ آرڈر آنے پر ہم آپ سے فوراً فون پر رابطہ کریں گے۔ آپ کا فون نمبر کیا ہے؟"

"آفر تمھاری طرف سے کیسے جائے گی؟ گدھے ہم خرید کر رہے ہیں، ہم ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ آفر تمھاری طرف سے جائے گی تو آرڈر بھی تمھارے پاس آئیں گے، لیٹر آف کریڈٹ بھی تمھارے نام اوپن ہوں گے۔" چچا نے دونوں بازو اوپر کر کے لہراتے ہوئے کڑک کر کہا۔

"چاچے، آپ کا یہ کام نہیں۔ آپ ان معاملات کو نہیں سمجھتے۔ ہمارے پاس مارکیٹ ریسرچ، کلیئرنگ فارورڈنگ، شپمنٹ کی پوری مشینری موجود ہے۔ ہم آپ کے بی ہاف پر ایکسپورٹ کریں گے اور اگر آپ کو منظور ہو تو شارپر لمیٹڈ کا دس فیصد کمیشن اباسین کو ڈیبٹ ہو جائے گا۔"

اقتصادی معاملات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میں نے انھیں ہمیشہ کومپلی کیٹڈ پایا۔

"ہم ایک طرح سے آپ کے ایجنٹس ہوں گے۔" شارپر نے سمجھایا۔

"تم ہمارے ایجنٹس ہو گے یا ہم تمھارے ایجنٹس ہوں گے۔ دُکھ بھریں بی فاختہ۔۔۔"

"چاچے، تم تو خواہ مخواہ گرم ہو رہے ہو۔ میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔۔۔"

"لیٹر آف کریڈٹ تمھارے نام کھلے گا۔۔۔"

"اور ہم رقم وصول کر کے تمھیں پاس آن کر دیں گے۔ سیدھی سی بات ہے۔۔۔"

"گارنٹی کیا ہے اس بات کی؟"

"ہم پرانے دوست ہیں۔ تمھارا مطلب ہے میں تم سے ہاتھ کر رہا ہوں؟"

ظہیر، شارپر اور چچا نے اس پیچیدہ مسئلے پر کچھ دیر بحث کی اور آخر طے ہوا کہ یہی ارینجمنٹ بہترین اور قابلِ عمل ہے۔ شارپر نے پھر ہمیں اپنا فون نمبر دینے کو کہا۔ مگر اباسین کا ٹیلی فون نہیں تھا اور ہم یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ ہمارے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔

"میرے جنرل مینیجر خود ہفتے میں ایک آدھ بار پرسنلی پوزیشن کا پتا کرتے رہیں گے۔" چچا نے کہا۔

جب ہم کیبن سے باہر آئے تو اس ڈیل سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ شو روم سے جاتے ہوئے چچا نے لنکاسٹر گاڑی کا آگے پیچھے سے پوری طرح معائنہ کیا اور اس کی شکل، ڈیزائن اور ٹرانسمیشن کے بارے میں اپنی رائے دی۔ کئی سال کار رکھنے کی وجہ سے وہ کاروں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔

اگلی صبح چچا عبدالباقی اپنے جینیئس بیٹے عبدالرحمٰن کے ساتھ ایک کار میں دفتر آیا۔ یہ شارپر لمیٹڈ کی لنکاسٹر نہیں بلکہ چار پہیوں پر نامعلوم ساخت کی قدیم فرتوت گاڑی تھی جس کا وِنڈسکرین غائب تھا، چھت کینوس کی تھی جو پیچھے تہہ ہو جاتی تھی (ایسی گاڑی ہواخوری کے لیے آئیڈیل خیال کی جاتی ہے۔)

اس نے بتایا کہ یہ اس کے ایک پڑوسی قطب الدین خاں کی موروثی گاڑی ہے جو اس کے ساڑھے آٹھ سو مانگتا ہے۔ چچا سرِدست اسے ٹرائی کرنے کے لیے لایا تھا۔ اس عجوبے کے مالکوں کا ادل بدل ہونا ابھی باقی تھا۔

"بہت اچھی گاڑی ہے،" اس نے بتایا، "صرف ایک نقص ہے۔ ایک گیلن میں پانچ میل کرتی ہے۔"

وہ عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر کیوں آیا تھا، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

اس روز ہماری آفرز کے جواب میں دو خط بھی ڈاک میں آئے -- آرڈر کے تو نہیں لیکن ان کی نوید دیتے ہوئے، کافی حوصلہ افزا۔ انہیں پڑھ کر مایوسی کے گھرے ہوتے ہوئے بادلوں میں روشنی کی کرن نمودار ہوئی۔ جوجو بیڈمنٹن کے خط میں ہم سے گدھوں کی عمر، کلوگرام وزن اور قدوقامت کے لحاظ سے الگ الگ آفرز بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ جارج پول کیٹ امپورٹرز نے لکھا تھا کہ آرڈر دینے اور لیٹر آف کریڈٹ کھولنے سے پہلے انہیں ان گدھوں کے سیمپل یعنی نمونے درکار ہیں۔

"اِیڈیٹس" چچا نے جھلاہٹ میں میز پر مکّا مارتے ہوئے کہا جس سے قلم دان گرتے گرتے بچا۔ "بھتیجے، ہم ان کو سیمپل کیسے بھیج سکتے ہیں؟

کیا وہ میکسیکو یا کہیں آس پاس جا کر گدھے نہیں دیکھ سکتے؟ گدھے ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں رنگ و نسل کا کیا فرق ہو سکتا ہے؟ اور پھر ان کی لاگت، ایرفریٹ وغیرہ کون دے گا؟ ظاہر ہے وہ بائی ایر جائیں گے۔"

میں نے ان کے اِیڈیٹس ہونے پر چچا سے اتفاق کیا۔

عبدالرحمٰن نے، جو مس میسی کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کی مشق کر رہا تھا، نہایت عقل مندی کی بات کی۔ "ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مختلف اقسام کے گدھوں کے فوٹوگراف بھیجے جائیں۔"

جن نظروں سے چچا نے مجھے دیکھا وہ کہہ رہی تھیں: دیکھا میرا بیٹا کتنا ہونہار ہے۔

"اور وہ دوسرے حضرات، جوجو بیڈمنٹن، جو ہم سے مختلف سائز وغیرہ کے الگ الگ کوٹیشن چاہتے ہیں؟"

"وہ بھی اِیڈیٹس ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ عمر کا سائز سے کوئی تعلّق نہیں۔ چار سال کا گدھا آٹھ سال کے گدھے سے سائز یا وزن میں زیادہ ہو سکتا ہے۔ کراچی کے گدھے کا عمر زیادہ ہونے پر وزن نہیں بڑھتا، جبکہ پنجاب کا گدھا۔۔۔"

"ڈیڈی، ان سے اس بات کی وضاحت کر دو،" عبدالرحمٰن نے تجویز پیش کی، "صرف کلوگرام وزن کے حساب سے کوٹیشن بھیج دو، یہی ان کا مطلب ہے۔"

ظاہر ہے اس انکوائری کا جواب دینے کے لیے کافی تحقیقی کام، غوروخوض اور وقت کی ضرورت تھی۔ ایسے مسئلے فوراً نہیں سلجھائے جا سکتے۔ البتہ سیمپل والے خط کا مناسب جواب ہم نے عبدالرحمٰن کے مشورے کے مطابق دو دن بعد لکھ بھیجا۔ میں اسی روز اپنا جاپانی کیمرا ٹانگے ٹرام میں چاکیواڑہ گیا اور وہاں کئی ایک گدھوں اور گاڑیوں سمیت گدھوں کی تصویریں کھینچیں۔ اپنے جنرل نالج میں اضافے کے لیے میں نے ان کے مالکوں سے (ان کی تصویریں بھی کھینچی گئی تھیں) ان گدھوں کی عمر، خوراک، قیمت اور عادات وغیرہ کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ گو تصویریں دیکھ کر چچا نے کہا کہ یہ سب بالشتیے مکرانی گدھوں کے فوٹوگراف ہیں

جو شاید امریکیوں کی نگاہ میں نہ جچیں، ہم نے وہ فوٹوگراف امپورٹرز کو ارسال کر دیے اور اپنے خط میں وضاحت کر دی کہ گدھے قد میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے اوصاف میں بےمثال ہیں۔

بیڈمنٹن والوں کے خط کا جواب دینے کے سلسلے میں چچا اور مَیں اکٹھے چچا کی اوپن ایر گاڑی میں، جس کو اس نے اباسین کے اکاؤنٹ میں مینیجنگ ڈائرکٹر کے ذاتی استعمال کے لیے خرید لیا تھا، چاکیواڑہ کی لی مارکیٹ گئے۔ وہاں ہم نے ایک گدھاگاڑی چلانے والے لڑکے کو دو روپے دے کر صرف اس کے گدھے کا وزن ایک لکڑی کی ٹال کے کانٹے پر کرایا اور اس کا قد بھی فیتے سے ناپا۔ بہت سے لوگ اور بچے اس موقع پر جمع ہو گئے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم گورنمنٹ کے اعدادوشمار کے محکمے کے انسپکٹر ہیں اور ہمیں کراچی کے گدھوں کا وزن کے لحاظ سے قدوقامت معلوم کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ دو تین اَور گدھوں کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا۔ ان ایکسرسائزز سے ہمارے پاس بالخُصوص مکرانی گدھوں کے بارے میں اتنے مفید کوائف جمع ہو گئے جو بیشتر لوگوں کے علم میں نہیں ہوتے۔ دفتر لوٹ کر چچا نے عبدالرحمٰن کی مدد سے (جو حساب میں تیز تھا) ان معلومات کی روشنی میں مختلف کلوگرام وزن کے گدھوں کی آفرز ورک آؤٹ کیں اور ہم امپورٹرز کے خط کا اطمینان بخش جواب دینے کے قابل ہوے۔

انھی دنوں ایک وِیک اینڈ پر ظہیر شارک مجھے اور چچا عبدالباقی کو ملیر کے پاس اپنے پپیتے کے فارم میں گدھے دکھانے لے گیا جو وہاں آبپاشی کی نہر کی کھدائی اور ڈھوائی کے سلسلے میں مصروفِ کار تھے۔ کھدائی کا کام پورا ہونے پر ہمارا اور ظہیر شارک کا انھیں ٹھیکےدار کی معرفت ان کے مالکوں سے خرید لینے کا پروگرام تھا تاکہ وہ امریکا سے آرڈر آنے پر اسٹاک میں موجود رہیں۔ اسٹاک میں مال کو روک کر رکھنا ہمیشہ ایک اچھی پالیسی ہے، ورنہ فوری سپلائی کی صورت میں بعض اوقات پریشانی ہوتی ہے۔ ہمارے یہ گدھے اپنے کام میں مگن، بیشتر خوش باش، قبول صوٗرت، تیکھے نقوش والے حساس حیوان تھے۔ میں نے ہمیشہ انھیں پسند کیا ہے کیوں کہ وہ

کام کے وقت زیادہ شوروغل اور خرمستیاں نہیں کرتے۔ اب بالخصوص غور سے ان کی بڑی بڑی، ہرنی کی سی آنکھیں، معصوم تھوتھنی اور چمک دار پوشش دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ نہایت حسین و جمیل مخلوق ہیں۔ ان میں ایک دو بھورے اور ایک سفید گدھا قدوقامت میں اتنے بڑے تھے جتنے گھوڑے۔ میں نے چچا سے اس کا ذکر کیا تو ظہیر شارک نے کہا کہ یہ گھوڑے ہیں۔ ان کے ہنہنانے نے اس کو صحیح ثابت کیا۔ گدھوں کی آواز جیسا کہ ہم جانتے ہیں قدرے مختلف ہوتی ہے۔ اتنے سارے اپنے گدھوں کو دیکھ کر ہمیں دلی مسرت ہوئی۔

"یہ کافی ڈیسنٹ حیوان ہے،" میں نے کہا، "لوگ اس پر ہنستے کیوں ہیں؟"

"یقیناً ڈیسنٹ،" چچا نے مجھ سے اتفاق کیا،" اسی لیے تو حضرت عیسیٰ نے یروشلم میں مصلوب ہونے کے لیے گدھے پر جانا پسند کیا۔ یہ بالعموم مسکین اور شریف طبع۔۔۔"

چچا یہ کہہ ہی رہا تھا کہ پاس کھڑے ہوئے ایک گدھے نے دولتّی جھاڑی اور اس کے سُم کا کچھ حصہ چچا کی ٹانگ سے آن چھوا۔ دراصل گدھے نے ایک اور گدھے کو دولتّی جھاڑی تھی اور چچا اتفاقاً بیچ میں آ گیا تھا۔

"بھتیجے، لو!" چچا نے معمولی سا لنگڑاتے ہوئے کہا، "تم خواہ مخواہ گدھوں کی فراہمی کے لیے فکرمند تھے۔ یہ تین سو گدھے تو ہمارے اسٹاک پر ہیں، جبکہ ابھی آرڈرز آنے شروع نہیں ہوئے۔ ہم نے آرڈر موصول ہونے کے بعد آٹھ مہینے کی ڈِلیوری ڈیٹ دی ہے، اور وہ بھی جہاز کی دستیابی کی شرط پر۔ یہ مدت چالیس ہزار گدھوں کی فراہمی کے لیے بہت کافی ہے۔"

دوپہر کو ہم نے ظہیر شارک کے فارم پر مرغ پلاؤ کا لنچ کھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اس مفید بزنس ٹرپ سے شہر واپس آئے۔

بظاہر یہ دیکھتے ہوئے کہ چچا عبدالباقی اب نئے وِنڈسکرین اور باڈی پر نئے سبز پینٹ سے مزیّن موٹرکار میں دفتر آنے لگا تھا اور جنرل مینیجر کو چھوڑ کر سب اسٹاف کو باقاعدگی سے وقت پر تنخواہیں مل رہی تھیں --

مزیدبرآں تین سو گدھے اِن ہینڈ تھے -- بعض لوگ یہ گمان کرتے ہوں گے کہ اباسین اب ماشاءاللہ مالی بحران سے نکل آئی ہو گی۔ وہ غلطی پر ہیں۔

حقیقت میں میاں فقیر محمد کی تیزی سے کم ہوتی ہوئی رقم کی وجہ سے کمپنی دیوالیہ پن کے کنارے پر ڈول رہی تھی اور تاریک بادل افق پر امنڈتے چلے آ رہے تھے۔ ہر نیا دن گزرے ہوئے دن سے بدتر ہوتا، اس کے باوجود کہ ہم اپنے فرائض کی بجاآوری میں رات دن ایک کیے ہوئے تھے (جیسا کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہی ہے۔)

دن اور ہفتے یوں ہی گزرتے گئے۔

امریکا کے امپورٹرز سے کوئی اور خط موصول نہیں ہوا -- نہ اِنکوائری اور نہ آرڈر۔ جوجو بیڈمنٹن اور جارج پول کیٹ نے بھی، جن کی انکوائریز کے جواب دینے میں ہم نے اتنی جان ماری تھی اور جن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، ہماری چٹھیوں کی رسید تک نہ دی۔ ہم نے بھی ریمائنڈر نہیں بھیجے، کیوں‌کہ چچا کا اب یہ خیال تھا کہ اسٹیٹس میں صدارتی انتخابات سر پر ہیں اور وہاں کا ہر کاروباری آدمی پرائمریز میں لنچ یا ڈنر کھانے میں مصروف ہے -- اور پوسٹ ماسٹر جنرل کا کوئی قصور نہیں۔ اس دوران اباسین کی ڈاک میں صرف ایک چٹھی آئی -- کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی کی جانب سے پچھلے پانچ مہینے کا بِل، سال بھر کے بقایاجات کے ساتھ کوئی نو سو روپے کا، جس کی ادائیگی چچا کی تحویل میں موجود میاں فقیر محمد کے پیسوں سے کر دی گئی۔ ابھی اباسین کے بینک اکاؤنٹ میں پانچ چھ ہزار کی رقم پڑی تھی۔

یہ نہیں کہ اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعات پیش نہیں آئے۔ حقیقت میں بہت سی باتیں بتانے کی ہیں، مگر میں کتاب نہیں لکھ رہا۔ ایک دن میری عدم موجودگی میں میر مسکین علی، جس کی اسٹیئرنگ راڈ چچا نے استعمال کی تھی، آن پہنچا اور بید ہلانے اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرنے کے بعد پانچ سو روپے لے کر ٹلا۔ اور ایک دفعہ انکم ٹیکس والے دو مشتبہ قسم کے لوگ آئے جو بظاہر کافی ڈیسنٹ نوجوان تھے۔ انھوں نے میرا اخراجات کا رجسٹر دیکھا، چائے اور پیسٹری سے لطف اندوز ہوئے اور تھری کیسلز کا پیکٹ جیب میں ڈال کر رخصت ہو گئے۔ چچا نے ان سے جلیل فارانی، انکم

ٹیکس کمشنر کی خیریت دریافت کی جو علیگڑھ میں پڑھے تھے۔ جاتے ہوے انھوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم پچھتر اسّی روپے کا انکم ٹیکس رِٹرن سال کے سال داخل کر دیا کریں۔

میں ہفتے میں ایک بار فرید شارپر لمیٹڈ کا چکر بھی لگا آتا، یہ معلوم کرنے کی خاطر کہ ان کی انکوائریز بارآور ثابت ہوئیں یا نہیں۔ شارپر میرے لیے ہمیشہ کافی وغیرہ منگواتا (اس کی بابت اپنی پہلی نظر کی ناپسندیدگی کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ وہ کافی خوش اخلاق اور مہمان نواز شخص ہے)، اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرتا، لنکاسٹر کاروں کے (جو ابھی تک کھڑی تھیں) قصیدے پڑھتا اور مجھے ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر اپنا اشاعتی سیکشن سنبھالنے کی دعوت دیتا۔ انکوائریز کے بارے میں وہ یہی کہتا کہ وہ اس معاملے پر پوری توجّہ دے رہا ہے، فون اور کیبلز پر سب بڑےبڑے امپورٹرز سے رابطہ ہو چکا ہے، آرڈر ملنے کے چانسز حوصلہ افزا ہیں، مگر ابھی تک کچھ فائنلائز نہیں ہوا وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ ہنستا تو ایسا لگتا جیسے کوئی تھاروبریڈ گھوڑا ہنہنا رہا ہو، اور میں ان لوگوں کو جو گھوڑوں سے مشابہت رکھتے ہیں پسند نہیں کرتا۔

میں نے ایک دفعہ چچا عبدالباقی کو شارپر کی جانب سے اس کے اشاعتی سیکشن کو سنبھالنے کی پیشکش کی بات بتائی۔

"ایک کمپنی کا جنرل مینیجر اور پارٹنر شارپر کی ماتحتی میں ایک برائےنام اشاعتی ادارے کا انچارج بننا کیسے قبول کرے گا۔ شارپر احمق ہے۔" اس نے طیش میں آ کر شارپر کے بارے میں ایسے کلمات استعمال کیے جن کو چھاپا نہیں جا سکتا۔

پھر تھوڑی ہی دیر بعد آنکھوں میں ایک دمک سی لیے ہوے وہ بولا: "بھتیجے بختیار، میرے ذہن میں آیا ہے کہ ہم سائیڈلائن کے طور پر پبلشنگ کا کام کیوں نہ شروع کر دیں۔ میں اپنی آٹوبایوگرافی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ہاتھوں ہاتھ بِکے گی۔۔۔ ہاٹ کیکس؟"

جوجو بیڈمنٹن والی چٹھی کے بعد چچا نے کوئی ڈکٹیشن نہیں دی۔ اس

کا جوش کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا۔ دفتر میں فی الواقع اب کوئی کام نہیں رہا تھا۔ مس میسی اپنے ساتھ پرس میں اون اور سلائیاں لے آتی اور وقت کاٹنے کے لیے اپنی لمبی مخروطی انگلیوں سے سویٹر بُنتی رہتی۔ کبھی کبھی ہم تینوں جہاز اور آبدوزیں ڈبونے کا کھیل کھیلتے اور جب اس سے تھک جاتے تو ساغر میاں سے اس کی غزلیں سنتے اور اس شام ہونے والی شادیوں کے محل وقوع پوچھتے جن میں اس کے بینڈ کو جانا ہوتا تھا۔ (چچا ایسی تین چار براتوں میں شامل بھی ہوا۔) چچا نے اب دفتر کے اوقات کی پابندی میں بھی ڈھیل کر دی۔ وہ خود ساڑھے دس بجے آتا۔ میں بھی "توپ و تفنگ" اور "عاقبت" کے دفتروں سے ہو کر لنچ سے کچھ پہلے پہنچتا۔ ("عاقبت" والے چاہتے تھے کہ میں ان کے لیے بھی ایک اَور قلمی نام سے کالم لکھوں۔) لنچ ہم اکثر اکٹھے ہی توکل ٹی ہاؤس سے منگوا کر کرتے جن کا مرغ مسالا برا نہیں ہوتا۔ یہ توکل ٹی ہاؤس کا اشتہار نہیں، مگر کبھی اس کو ٹرائی کر کے دیکھو۔ ایک پلیٹ کے صرف ڈھائی روپے۔ مس میسی اپنی سینڈوِچز لے کر آتی، اور وہ بھی اچھی ہوتی تھیں۔ تین چار بجے دفتر بند کر کے ہم کبھی کبھار مس میسی کو کار میں اس کے گھر چھوڑ آتے جو سولجر بازار میں تھا اور پھر الفنسٹن اسٹریٹ میں تفریح وغیرہ کرتے۔ (چچا اپنی ڈاڑھی ہمیشہ اپنے بریف کیس میں رکھتا تھا۔)

لیکن امن چین کے تین چار ہفتوں کے بعد ہم ایک ایسے وبالِ جان میں گرفتار ہو گئے جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ایک دوپہر کو ہم لنچ کر رہے تھے کہ منسٹر میاں پھجّے کا بھائی میاں فقیر محمد، جس کی جمع کردہ رقم میں سے اب کوئی ہزار بارہ سو کا بیلنس بینک میں محفوظ تھا، آ دھمکا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر کا پتا کیوں‌کر لگا لیا۔ بہرحال وہ اب، اصلی اور سالم، موجود تھا: اس کا پانچ فٹ آٹھ انچ کا سراپا، مڑے ہوئے کان، گھٹا ہوا سر اور ٹوٹی ہوئی ناک۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"السلام علیکم خاں صاحب، کتّھے دفتر بنایا جے---"

"آؤ میاں صاحب،" چچا کا رنگ فق تھا، "کھانا کھاؤ۔"

"روٹی تے اسی کھا آئے آں--- چلو ہور کھا لینے آں۔ جناب دا دل بُرا نہ

ہووے۔"

کھانے کے بعد اس نے پوچھا: "بادشاہو، ساڈی رقم دا کے بنایا جے؟ منافع شنافع؟"

چچا نے نہایت خوش اخلاقی سے اسے بتایا کہ باہر کی پارٹی سے ڈِیل مکمل ہو گئی ہے اور انشاءاللہ معاہدے کے مُطابق دسمبر کے مہینے میں ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں نفع نقصان کا حساب کتاب ہو گا۔

"اے نقصان دی کے گل کیتی جے؟"

"میاں صاحب، انشاءاللہ نفع ہو گا۔"

ہم نے اسے یقین دلایا کہ اس کا روپیہ اتنا ہی محفوظ ہے جتنا اس کی اپنی جیب میں۔ ہمارا خیال تھا کہ اپنی اِنویسٹ منٹ کی پوزیشن معلوم کر کے وہ چلا جائے گا، مگر وہ نہیں گیا۔

"کوٹھی جا کے کے کرنا جے؟ تہاڈے نال گپ شپ کرنے آں۔ آخر ساڈے شریک او۔"

وہ چچا کے سامنے والی کرسی کو ایک طرف کیے اور مس میسی کی ٹانگوں پر ٹکٹکی لگائے دنیا جہان کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ کراچی کوئی شہر ہے، نہ لسّی نہ خالص دودھ۔ پتا نہیں اس شہر میں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ پھر وہ پہلوانوں اور اکھاڑوں وغیرہ کے قصّے سناتا رہا۔ اس نے مجھے بھی زور کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سارے عرصے میں اس کی نگاہیں مس میسی کی ٹانگوں پر جمی رہیں جس کا چہرہ لال ہوتا جاتا تھا۔ آخر چچا نے اس سے کہا: "تم آدھے دن کی چھٹی مانگ رہی تھیں۔ دفتر میں زیادہ کام نہیں۔ تم جا سکتی ہو۔"

مس میسی چلی گئی مگر میاں فقیرا بیٹھا رہا۔ اس کے پاس انتہائی خوفناک گفتگو کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ چار بجے ہم بمشکل اٹھے اور اسے بونس روڈ پر میاں پھجّے منسٹر کی کوٹھی پر اتار آئے۔ ہم نے سچ مچ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹلی۔

لیکن بلا نہیں ٹلی۔ دوسرے دن میاں فقیر محمد پھر دفتر میں موجود تھا۔ اور اس سے اگلے دن بھی۔ وہ روز دفتر آنے لگا، اور جتنی دیر بیٹھتا (ہم دفتر جلدی بند کرنے کی کوشش کرتے) ہونٹوں کے کناروں سے رال ٹپکاتا

مس میسی کی ٹانگوں کو گھورتا رہتا۔ ہم پیچ و تاب کھاتے، لیکن منسٹر میاں پھجے کے خیال سے کچھ کر نہ سکتے تھے۔

چوتھے دن اسے کوٹھی پر اتارنے کے بعد چچا عبدالباقی نے کہا: "بھتیجے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پیرِ تسمہ پا سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ میں تو اس کی ایسی تیسی کر دیتا -- تم مجھے جانتے ہی ہو -- مگر اس نے ہماری کمپنی میں پچیس ہزار انویسٹ کیے ہیں۔ پھر مجھے میاں پھجّے کا بھی لحاظ ہے۔"

میں ان دنوں گائی لوتھبی کا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا جس میں ایک ڈاکٹر اپنی چوتھی بیوی کو ایک سرجری کے آلے کی مدد سے بوٹی بوٹی کرتا ہے، اس قیمے کو ایک ٹرنک میں ڈالتا ہے، ٹرنک کو کار کی ڈکی میں رکھ کر سمندر کے کنارے لے جاتا ہے، ٹرنک سے قیمے کو مچھلیوں اور ابابیلوں کے لیے الٹ دیتا ہے اور خالی ٹرنک کو، جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا، کار میں رکھ کر واپس لے آتا ہے۔

میں نے چچا کو اسی طریقِ کار پر عمل کرنے کی تجویز پیش کی۔ "اور چوں کہ ہمارے پاس ٹرنک نہیں ہے، اس لیے ہم اسے رات کے وقت گٹھری میں باندھ بوندھ کر نوشی اور بلونگڑوں کے لیے باربر اینڈ باربر یا توکل ٹی ہاؤس کے سامنے ڈال آئیں گے۔"

"علاج تو اس کا یہی ہے بھتیجے، لیکن یہ زیادہ قابلِ عمل نہیں ہے۔"

مزید غوروخوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ میاں فقیرے سے چھٹکارے کی صورت یہی ہے کہ کل سے کچھ دن کے لیے اباسین کے دفتر کو بند کر دیا جائے۔ ویسے بھی دفتر میں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔

چچا نے مجھے ہدایت کی کہ میں اگلے روز صبح دفتر آ کر مس میسی اور دوسرے عملے یعنی ساغر میاں کو اطلاع دے دوں کہ ہم لوگ باہر جا رہے ہیں اور دفتر دس دن بند رہے گا۔ مجھے ان کو یہ بھی یقین دلانا تھا کہ انھیں تنخواہ پورے مہینے کی دی جائے گی۔

"اور توکل ٹی ہاؤس کو نوشی کے دودھ کے لیے پیسے دینا نہ بھولنا بھتیجے،" اس نے کہا، "تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھنا۔ ساغر میاں کو ہرگز نہ دینا۔ مجھے شک ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے لیے ہمارے لیٹرپیڈ استعمال کرے

گا۔"

"میاں فقیر محمد دفتر کو مسلسل بند پا کر تمھارے گھر بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"او نو، اس کے فرشتے بھی وہاں پر نہیں مار سکتے۔"

"اور اگر آ گیا تو؟"

"تو حسبِ معمول ایچ اے باقی گھر پر نہیں ہو گا۔ برخوردار عبدالرحمٰن اس معاملے کو سنبھال لے گا۔ اور اگر اس نے زیادہ شوروغل کیا تو ہم ہمیشہ تمھارے دوست آبنوسی کے پاس مکھیراں گھوڑے والی جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمارے چار قلندر ابھی وہیں ہوں گے۔"

اس خوش گوار موڈ میں ہم الفنسٹن اسٹریٹ اور وکٹوریا روڈ کی رونقوں سے لطف اندوز ہوے۔ پھر پیراڈائز سنیما کے سامنے والی بار میں جا بیٹھے اور ایک مدت کے بعد تین چار بیئریں پیں۔ اور گدھوں اور فرید شارپر اور ملک فقیر محمد کے ذکر کے بجائے ہم نے ایک دوسرے کو شیکسپیئر اور غالب کے اشعار سنائے -- ایک مدّت کے بعد۔

دوسرے روز میں ساڑھے آٹھ بجے اباسین پہنچا۔ ساغر میاں نے میرے آنے سے پانچ منٹ پہلے دفتر کھولا تھا اور جھاڑپونچھ کر رہا تھا۔ ہمیشہ سے وقت کی پابند مس میسی بھی ایک پیازی رنگ کے اسکرٹ اور بلاوز میں آ گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ دفتر میں دس دن چھٹی رہے گی کیوں کہ چچا اور میں ایک شادی پر مکھیراں گھوڑے والی جا رہے ہیں۔ مس میسی کچھ حیران سی ہوئی اور ساغر میاں پر اوس سی پڑ گئی۔ اس نے دفتر کو تالا لگایا اور میں نے چابی اس سے لے لی۔ ساغر میاں نے اسے پسند نہ کیا۔ وہ غالباً چابی ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہو گا۔

میں مس میسی کو اپنے ہمراہ صدر لے گیا اور وہاں انڈیا کافی ہاؤس میں کافی وغیرہ کے احکامات صادر کرنے کے بعد میں نے اسے دفتر بند کرنے کے فیصلے سے تفصیلاً آگاہ کیا۔

"میں پچھلے مہینے سے ریزائن کرنے کا ارادہ کر رہی تھی،" اس نے کہا،

"مگر تمھاری وجہ سے اب تک ٹِکی ہوئی ہوں۔"

"تمھاری تنخواہ تمھیں ہر حال میں ملتی رہے گی، اباسین پر جو کچھ بھی گزرے۔"

"اگر میں ریزائن کر دوں تو تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم پہلے کسی اچھی فرم میں جاب سِکیور کر لو۔"

"میرے پاس ایک آفر ہے، اسٹینو ٹائپسٹ کی۔ وہ لوگ چار سو دیں گے۔ انگریزی فرم ہے -- انگلش الیکٹرک کمپنی۔"

میں نے اس کے لیے الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک خوب صورت پروں والا ہیٹ خریدا، اسے پہنایا اور اسے سولجر بازار میں اس کے گھر چھوڑ آیا۔

جدا ہوتے وقت اس کی چوہیا جیسی چھوٹی سی لڑکی کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ مگر وہ ہنسی۔

"بائی بائی!"

"بائی بائی!"

کیا مجھے اس سے محبّت تھی؟ میں نہیں جانتا۔

اباسین کا دفتر بند ہونے کے بعد بھی میں تین چار بار فرید شارپر کے پاس گدھوں کے آرڈرز کے بارے میں پتا کرنے گیا، مگر ہمیشہ اس کے پاس ایک ہی کہانی ہوتی تھی، کہ دو تین فرموں نے آرڈر دینے کا وعدہ وغیرہ کیا ہے لیکن ابھی کچھ فائنلائز نہیں ہوا؛ کچھ دن یا ہفتے اَور لگیں گے۔ تیسری بار جانے پر اس نے شارپر پبلشرز کی شائع کی ہوئی پہلی کتاب "چبھتی ہوئی کرچیں" از فرید اصفہانی مجھے پیش کی جس کے ٹائٹل پر ایک نہایت بےہودہ کیوپِڈ کو تھری پیس سوٹ میں ملبوس فرید شارپر کے سینے کا نشانہ باندھتے ہوے دکھایا گیا تھا۔ وہ ہر بار مجھے شارپر پبلشرز کا کام سنبھالنے کی دعوت دیتا۔

میں ظہیر شارک سے بھی ملا جس نے مجھے بتایا کہ اس کے پپیتوں کے فارم پر کھدائی کا کام ابھی چل رہا ہے اور گدھے فارم پر -- یعنی ہمارے

اسٹاک پر -- موجود ہیں۔

چچا عبدالباقی کو میں اس پروگریس سے مطلع کرتا رہتا۔ اس نے اپنی سوانح عمری پر کام شروع کر دیا تھا اور پہلی چھ سطریں لکھ لی تھیں۔ میں نے اس سے مس میسی کے اباسین چھوڑنے کا ذکر نہ کیا کیوں کہ یہ خبر اس پُرشفقت شخص کے لیے صدمے کا موجب ہوتی۔ وہ خود بھی ایک بار ڈاڑھی لگائے اپنی کار میں میرے فلیٹ پر آیا اور مجھے اطلاع دی کہ حبیب بینک میں اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے اکاؤنٹ کا بیلنس اب دس روپے ہے اور بینک نے اکاؤنٹ کلوز نہیں کیا۔

میں "توپ و تفنگ" میں اپنا معلوماتی کالم باقاعدگی سے لکھتا رہا۔ "عاقبت" والوں نے بھی مجھے اپنا نمائندۂ خصوصی مقیم ملتان اور فیچر رائٹر رکھ لیا تھا۔ ہفتہ وار "اللہ اکبر" والوں کی بھی خواہش تھی کہ میں ان کے لیے لکھوں مگر ہم خلجی ان لوگوں میں سے نہیں جو آدھی رات کا تیل جلانے میں یقین رکھتے ہیں۔

اباسین ٹریڈنگ کمپنی کی چھٹیوں کے دسویں دن میں صبح "توپ و تفنگ" کے دفتر گیا تو مقامی خبروں کے سب ایڈیٹر حلیم شیروانی سے علیک سلیک ہوئی۔

"کیوں پارٹنر، تم آج اپنے کالم کے لیے ویسٹ وہارف جا رہے ہو نا؟"

"ویسٹ وہارف پر کیا ہے؟"

"مجھے کل ہی اپنے کسٹم والے کزن سے معلوم ہوا کہ آج دو ہزار گدھے امریکا کے لیے جہاز پر لادے جا رہے ہیں۔ جہاز بتاؤں کون سا؟ ایس ایس فردوسِ بریں۔ وہی جو کراچی چٹگانگ کے درمیان چلتا ہے اور سال میں ایک بار حج روٹ پر۔ روح پرور سماں ہو گا۔ چائے پلاؤ -- کیسا ٹِپ دیا ہے؟"

"مذاق مت کرو۔" میں نے اپنے دل کو ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔

"پارٹنر، سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھو کیسا ٹِپ دیا ہے، تمھارے کالم کے لیے پُرلطف مواد۔ اب چائے منگواؤ، اور سموسے بھی۔ میں آج ناشتہ کرنا بھول گیا۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ ذہن میں کچھ شکوک سے اُبھرے۔

"ایکسپورٹرز کون ہیں؟ کوئی پرائیویٹ فرم یا گورنمنٹ؟"

"یہ میں نہیں جانتا پارٹنر۔ تفصیلات مجھے نہیں معلوم، مگر چوں کہ یہ جہاز۔۔۔"

"ٹائم؟"

"ٹائم پارٹنر؟ لوڈنگ شروع ہو چکی ہو گی یا ہونے والی ہو گی۔ مگر پوری کھیپ تو کہیں شام تک لوڈ ہو سکے گی۔"

مجھے یاد آیا کہ دو بجے مجھے "عاقبت" کے لیے زنجبار سے آئے ہوئے مولانا غربی الشتابی سے انٹرویو کے لیے بیچ لگژری جانا ہے۔ میں نے مولانا شتابی کے سیکرٹری سے اس وقت کی اپائنٹ منٹ بڑی مشکل سے لی تھی۔ میں نے حلیم شیروانی سے اس الجھن کا ذکر کیا۔

"مٹی ڈالو شتابی پر۔ وہ کل بھی یہاں ہو گا اور پرسوں بھی۔ تم کہو تو میں اس کا انٹرویو لے آتا ہوں۔ پارٹنر، گدھے روز روز لوڈ نہیں ہوتے۔ مِس مت کرو۔ میرا اپنا دل کرتا ہے تمھارے ساتھ جانے کو۔"

واقعی مِس کرنے والی بات نہ تھی۔ اور میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ گدھے کون ایکسپورٹ کر رہا ہے، اور پھر ایس ایس فردوسِ بریں پر۔

میں اپنا کیمرا مولانا غربی الشتابی سے انٹرویو کے لیے ساتھ لے کر چلا تھا۔ میں نے بولٹن مارکیٹ سے کیماڑی کے لیے ٹرام پکڑی اور سیدھا ویسٹ وہارف کے گیٹ پر جا اترا۔ آگے گودی میں بہت سے جہاز لنگرانداز تھے، رنگارنگ جھنڈے لہراتے، عجیب و غریب ناموں والے؛ ایس ایس ڈم ڈوس، ایس ایس بھنگڑا، ایس ایس چیچاوطنی۔ سامان کرینوں کے ذریعے اتارا اور لادا جا رہا تھا۔ کسٹم کے شیڈوں میں سے گزرتا ہوا میں آخر وہاں جا پہنچا جہاں دنیا جہان کے گدھے جمع تھے۔ گودی میں لگے ہوئے جہاز کے پیٹے پر نام پڑھا: ایس ایس فردوسِ بریں۔ میں نے پہلے اتنے گدھے ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھے تھے -- اور وہ ظہیر شارک کے پپیتوں کے فارم پر ہمارے اسٹاک کے گدھوں کی طرح شریف الطبع اور کم گو نہیں تھے۔ ڈھینچو ڈھینچو کی صدا کبھی ایک طرف سے آتی تھی کبھی دوسری طرف سے۔ ان میں سے چند ایک ایسی حرکتیں کر رہے تھے جو بالعموم پبلک میں نہیں کی جاتیں۔

میرے کھڑے کھڑے گدھوں سے لدے دو تین ٹرک اور آئے اور گدھے اتارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ سفید دودھیا یونیفارم میں جہاز کا باریش

کپتان اور اس کا عملہ عرشے کے کٹہرے پر کہنیاں ٹیکے اس روح افزا منظر کا تماشا کر رہا ہے۔ ان میں ایک چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ اوہ! یہ تو میرا ایک زمانے کا دوست فضل تھا جس نے مکینیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما لینے کے بعد مرچنٹ نیوی میں ملازمت کر لی تھی۔ میں نے اسے ویو کیا، لیکن وہ گدھوں کو دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ اس نے جواب میں مجھے ویو نہیں کیا۔

بڑے بڑے کریٹوں میں چارا، بھوسا اور دوسری چیزیں جو گدھے کھاتے ہیں کرین کے ذریعے جہاز میں لادی جا رہی تھیں۔ میں نے کچھ فوٹوگراف لیے۔ اسی اثنا میں جہاز پر گینگ پلینک (gang plank) لگا دیا گیا اور اونی بالوں والے مکرانی لڑکے گدھوں کو سونٹیوں سے ہانک کر جہاز پر چڑھانے لگے۔ گدھوں کے اِدھر اُدھر سرکنے سے مجھے ایسا لگا کہ وہ امریکا جانے پر خوش نہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کچھ اور فوٹوگراف لیے۔

اور تب اچانک مجھے خاکستری بش شرٹ میں اینٹھی ہوئی مونچھوں والا میجر پنگل دکھائی دیا جس کے بارے میں شارپر نے ہم سے کہا تھا کہ وہ اس کمپنی کا کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ ہے۔ ہف ہف کرتے میجر پنگل کی مونچھیں اس وقت اور زیادہ اینٹھی ہوئی تھیں اور وہ بدحواس سا لگتا تھا۔ اب ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی۔ پنگل نے مجھے نہیں دیکھا۔

پھر ایک کار کسٹم شیڈ کے نیچے آ کر رکی۔ یہ اس کار سے مشابہ تھی جس میں ظہیر شارک ہمیں اپنے پپیتوں کے فارم پر لے گیا تھا۔ میں شیڈ کی دیوار کے پیچھے دبک گیا۔ پنگل کار کی طرف گیا اور اس میں بیٹھے ہوئے آدمی سے دس بارہ منٹ کھسرپھسر کرتا رہا۔ زرق برق ڈاڑھی کار سے نیچے نہیں اتری مگر میں اسے پہچان گیا۔ وہ ظہیر شارک کا ماموں تھا، گدھے کا بازار کا بھاؤ بتانے والا۔

میں نے اپنی آڑ سے چند اور فوٹوگراف لیے۔ کار چلی گئی اور میجر پنگل واپس آ گیا۔

گدھے لد گئے تو میجر بھی گینگ پلینک پر سے پھدکتا ہوا جہاز پر گیا، غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں ان کے قیام اور طعام کا انتظام معقول ہے یا نہیں۔ میں اسے جہاز کے عرشے پر چلتا دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر جہاز پر

رہ کر وہ پلینک سے نیچے اتر آیا۔ چند مکرانی لڑکے بھی اس کے ساتھ اترے۔ پھر پنکل جیسے الہ دین کے جن کی طرح غائب ہو گیا اور مجھے کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کدھر کو گیا ہے۔

میرا دوست فضل پھر کٹھرے پر آ کر خالی سین پر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس دفعہ اس نے مجھے دیکھ لیا، مسرت سے مسکرایا اور مجھے جہاز پر آنے کی دعوت دی۔ جہاز پر گدھے ہی گدھے تھے -- عرشوں پر گدھے، گیلریوں میں گدھے، سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کے کیبنوں میں بھی دو دو گدھے۔ ایس ایس فردوسِ بریں کوئی بڑا جہاز نہیں تھا، صرف چھ ہزار ٹن کا۔ فضل نے مجھے بتایا کہ امریکا میں پاکستانی سفیر طہرانی کے کسی چکر یا اثرورسوخ کی وجہ سے اس سے گدھے ڈھونے کا کام لیا جا رہا ہے اور ایکسپورٹر کے ہاتھ بہت لمبے معلوم ہوتے ہیں۔

شام کو میں جمشید روڈ پر چچا کے گھر پہنچا اور دن کی کارگزاری کی پوری رپورٹ اسے پیش کی۔

"بھتیجے، میں نے پہلے ہی سینس کر لیا تھا کہ یہ دونوں کوئی چال بازی کریں گے،" اس نے کہا۔ "ہماری غلطی تھی کہ ہم ان کے پاس گئے۔"

"مگر چچا، میں ظہیر شارک کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ تو تمھیں سر سر کہتا اور تمھارے سامنے بچھا جاتا تھا۔"

"چور کا ساتھی گرہ کٹ۔ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ ظہیر شارک بڑا گھنّا میسنا شخص ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔"

گھر لوٹتے ہوئے میں نے کیمرے کی فلم بندر روڈ پر ہیپی فوٹو اسٹوڈیو کو دے دی۔ وہ کوٹک اور ایفی شنٹ ہیں، اور یہ اشتہار نہیں۔

اور یہ، کم و بیش، گدھوں کی ایکسپورٹ کا قصہ ہے۔

دو دن بعد فوٹوگراف ہمیں مل گئے۔ تصویروں میں میجر پنکل اور ظہیر شارک کی کار میں بیٹھا ہوا زرق برق ڈاڑھی والا اس کا ماموں صاف

پہچانے جاتے تھے۔ میجر کی تصویروں کی بیک گراؤنڈ میں گدھے تھے۔ ایس ایس فردوسِ بریں میں گدھوں کے لادے جانے کی کئی ایک تصویریں تھیں۔ ہم کار میں پہلے ظہیر شارک کے ہاں گئے اور گدھوں کے لادے جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسے ساتھ لے کر ہم فرید شارپر لمیٹڈ گئے جہاں دو فلوٹڈ ٹرانسمیشن لنکاسٹر گاڑیاں ابھی تک کھڑی تھیں۔

کافی اور کریم رولز کے بعد چچا نے سرسری سے انداز میں شارپر سے امریکی امپورٹروں کے آرڈرز کی پوزیشن کے بارے میں پوچھا۔ اس نے وہی جواب دیا کہ ایک دو فرموں نے دلچسپی ظاہر کی ہے مگر ابھی کچھ فائنلائز نہیں ہوا۔

"اور وہ دس ہزار گدھے کس نے ایکسپورٹ کیے جو آٹھ مئی منگل کے روز ایس ایس فردوسِ بریں پر سوار کرائے گئے؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ دونوں کے چہروں کے رنگ اڑ گئے اور وہ ایسے اسکول کے لڑکوں کی طرح لگنے لگے جن سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔

فرید شارپر نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔

ظہیر شارک بولا: "سر، آپ کو یہ کس نے بتایا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے! آرڈرز آتے تو فرید صاحب فوراً آپ کو بتاتے۔ آرڈرز ہی نہیں آئے۔"

"تو سنو،" چچا نے کڑک کر کہا، "میں کہتا ہوں کہ تم دونوں نے مل کر ہمارے گدھے ایکسپورٹ کیے ہیں۔ وہ دس ہزار گدھے جو آٹھ مئی منگل کے روز ایس ایس فردوسِ بریں پر شپ کیے گئے اخلاقی اور قانونی لحاظ سے ہمارے، اباسین ٹریڈنگ کمپنی کے گدھے تھے۔۔۔"

"سر۔۔۔"

فرید شارپر کی آنکھیں چھت پر لگی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے کی رنگت چاک کی طرح سفید تھی۔ اس نے ایک لفظ "نہیں" کہا اور دراز کھولنے لگا۔ شاید اس میں اس نے اپنا پستول رکھا ہوا تھا تاکہ خودکشی کرنے میں دقّت پیش نہ آئے۔

پھر چچا نے مجھے بریف کیس میں سے تصویریں نکالنے کو کہا۔ گدھوں کی بیک گراؤنڈ کے سامنے میجر پنگل کی تصویر فرید شارپر کو دکھائی گئی۔

"میرا خیال ہے یہ تمھارا میجر پنگل ہے--- پنگل کو بلاؤ۔ اگر تم اسے نہیں پہچان سکتے تو وہ اپنےآپ کو پہچان لے گا۔"

ظہیر شارک کو اس نے وہ تصویر دکھائی جس میں میجر پنگل کھڑا کار میں بیٹھے زرق برق ڈاڑھی والے آدمی سے بات چیت کر رہا تھا۔

"مجھے تو یہ کچھ کچھ تمھارا ماموں لگتا ہے۔"

ان دونوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ پھر چچا نے ان کی وہ ایسی تیسی کی جسے میرے تجربے میں فقیدالمثال کہا جا سکتا ہے۔ اس نے انھیں ان کی آپ بیتیاں ذہن نشین کرائیں، مبادا وہ انھیں بھول چکے ہوں۔

پھر ہم مناسب وقار سے خراماں خراماں چلتے ہوئے فرید شارپر کے کیبن سے باہر آ گئے۔

باہر دن چمکیلا اور اُجلا اُجلا تھا۔

اسد محمد خاں

آدمی نامہ

۱

اس وقت تک بجلی سب گھروں میں نہیں آئی تھی، اور ریڈیو تو محلّے میں کسی ایک گھر میں ہوتا ہو گا۔ بہت سے محلّے تو ایسے تھے کہ وہاں ریڈیو والا گھر بھی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں نواب صاحب کے وہاں بجلی بھی تھی اور ریڈیو بھی۔ دوسری عالمی جنگ چِھڑی ہوئی تھی اور ہمارے دادا کی تسلّی صرف اخبار پڑھ کر نہیں ہوتی تھی۔ پھر نواب صاحب کی ان کی دوستی بھی بہت تھی، اس لیے جب نواب صاحب نے باربار مدعو کیا تو دادا بھی ریڈیو سننے جانے لگے۔

ہماری حیثیت دادا کے اے ڈی سی کی تھی، چناں چہ نواب صاحب کی ریڈیو والی محفل میں ہم بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی میں جہاں شام کو فرش ڈُھلنے کے بعد صندوق کا صندوق ریڈیو اٹھا کر لایا جاتا اور تقریباً فرش میں نصب کیا جاتا تھا، مہمانوں کی بھاری بھرکم کرسیوں کے ساتھ ہمارے لیے بھی بِنا ہتّھوں کی ایک چھوٹی کرسی بِچھنے لگی۔ ہماری کرسی دادا والی کرسی اور نواب صاحب کی آرام کرسی کے درمیان ڈالی جاتی تھی، وہ اس لیے کہ ہم دادا کے قرب کی وجہ سے ڈسپلن میں بھی رہیں اور ریڈیو کی نیلی آنکھ کو آوازوں کے اتارچڑھاؤ کے ساتھ جھپکتے ہوے بھی دیکھتے جائیں، کیوں‌کہ ریڈیو کی گھن گرج اور اس کی بھاری بھرکم موجودگی میں ایک یہی چیز ہماری دلچسپی کی تھی۔ نواب صاحب کی آرام کرسی کے قریب اسے بچھائے جانے کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہوا کہ ہمیں نواب صاحب کو قریب سے دیکھنے اور

محلّے کے بچوں کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ ان کے لباس، کنجوسی اور حد سے بڑھی ہوئی صفائی پسندی کے سوا بہ ظاہر کوئی ایسی بات نواب صاحب میں نہیں تھی جو محلے کے بچے اور افواہ پسند لوگ ان میں اتنی دلچسپی لیتے۔ ہم نے ایک خاص بات ضرور نوٹ کی تھی کہ نواب صاحب مسکراتے بہت کم تھے اور کبھی ضرورت پڑے تو یہ کام وہ بڑی خِسّت سے کرتے تھے، جیسے مسکرانے میں بھی کچھ خرچ ہوتا ہو۔ اسی طرح کپڑوں کا معاملہ بھی تھا۔ وہ اپنے گھر میں، یا گھر کے سامنے سڑک پر ہوتے تو چوخانے والا تہہ بند اور بےداغ سفید نیم آستین پہنے رہتے۔ یہ نیم آستین واسکٹ سے بس اتنی مختلف تھی کہ واسکٹ میں کہنیوں تک آستینیں نہیں بنائی جاتیں۔ نواب صاحب یہ لباس اور کھڑاویں اپنے گھر میں اور گھر کے عین سامنے تک پہنے رہتے تھے۔ اگر انھیں دس قدم سڑک پار کر کے ہمارے گھر بھی آنا ہوتا تو وہ پورے لباس میں آتے تھے، یعنی شیروانی اور شیروانی ہی کے کپڑے کی ٹوپی۔ ڈھیلا پےجامہ اور سیاہ بادامی پیٹنٹ چمڑے کے پَمپ جن پر اسی رنگ کی ریشمی تِتلی ٹکی ہوئی۔

نواب صاحب مِراق کی حد تک صفائی پسند تھے۔ گھر کا تو ذکر ہی کیا، انھیں سامنے سڑک پر بھی بےترتیبی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہی ان کی نامقبولیت کی بنیادی وجہ تھی۔

ہمارے علاقے کے لیے یہ لباس اور اتنی صفائی پسندی کچھ انوکھی سی بات تھی۔ پھر نواب صاحب، جو محلے کے سب سے آسودہ حال آدمی تھے، اس وجہ سے بھی مقبول نہ ہو سکے ہوں گے کہ کنجوس تھے۔ ہم بچوں کو تو ان کی کنجوسی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا؛ ہاں محلے کی ذیلی گلیوں میں کچھ فاصلے پر جو لوگ رہتے تھے انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ نواب صاحب کے گھر کوئی تقریب کیوں نہیں ہوتی۔ ان کے گھر کبھی دیگیں نہیں کھڑکتی تھیں۔ کوئی اولاد ہی نہیں تھی جو یہ سب پھیلاوا کیا جاتا۔ قریب و دور کے عزیز شاید اس بات پر ناراض بھی رہتے تھے کہ اس قدر مال و متاع کے باوجود نواب صاحب یا ان کی بیگم کوئی بچہ کیوں نہیں گود لے لیتے۔

ہمیں نواب صاحب سے بس اتنی شکایت تھی کہ ایک مدّت سے ان کی ریڈیو محفل میں شرکت کر رہے تھے، پھر ہم بچّے بھی تھے، کبھی جو ہمارے

لیے اندر سے کوئی بسکٹ، ٹافی یا پھل انھوں نے منگوایا ہو۔ نوکر ایک جہازی قسم کا پیچوان ضرور اٹھا لاتا تھا، یا بلّور کی طشتری میں پندرہ بیس الائچیاں رکھ جاتا تھا۔ پیچوان اور الائچیاں، ہمارے لیے دونوں ہی بےکار تھیں۔ پیچوان تو دادا تک کے لیے بےکار تھا۔

محلے کے لڑکوں، اور گاہے گاہے ذیلی گلیوں میں رہنے والوں نے اپنی ناپسندیدگی اور ملال کے اظہار کا ایک طریقہ یہ نکالا تھا کہ نواب صاحب کی دیوار پر یا ان کے بڑے پھاٹک پر کوئلے، گیرُو یا کالک سے لکیریں کھینچ دیتے، یا آدمی، درخت یا چڑیا کی شکلیں بنا دیتے تھے، جو اس زمانے میں بہت آسانی سے چند ہی لکیروں میں بن جاتی تھیں۔ دیواروں پر کافر وغیرہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ بھی ضرور لکھا جاتا۔

یہ بدرنگ لکیریں اور شبیہیں جیسے نواب صاحب کے دل پر خراشیں ڈال دیتی تھیں۔ اپنی نیم آستین، تہہ بند اور کھڑاویں پہنے، کوُچی، تسلا یا رنگ کا ڈبا اٹھائے گھر سے نکلتے، اور لاحول پڑھ پڑھ کر انھیں مِٹانے یا ان پر پلستر کرنے کا جتن کرتے۔ اب لکیریں اور شبیہیں بنانے والے دور ذیلی راستوں اور گلیوں کے موڑ پر کھڑے نواب صاحب کو اور ان کے نوکر کو ہلکان ہو ہو کر لکیریں مٹاتے، سفیدی اور رنگ پھیرتے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

بہت سے لوگ نواب صاحب کے خلاف افواہیں اڑا کر بھی دل کا غبار نکالا کرتے تھے۔ ایک مقبول افواہ، جو ہمارے گھر میں بھی گشت کر چکی تھی، یہ تھی کہ ان کی زمینوں، باغوں سے جو اعلیٰ قسم کے آم اور دوسرے پھل آتے ہیں، نواب صاحب وہ اپنے گھروالوں تک کو نہیں کھانے دیتے۔ شیروانی، ٹوپی اور پمپ شوُز پہن کر خود جاتے ہیں اور ریل کی بِلٹی چھڑا کر براہِ راست ساری پیٹیاں پھل بازار میں نیلام کر آتے ہیں۔

اس افواہ کو اس لیے تقویت پہنچتی تھی کہ نواب صاحب نے کبھی جیتےجی ہمارے گھر بھی چار آم نہیں بھیجے۔ ہاں ان کے انتقال کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ جب تک بیگم زندہ رہیں، موسم کے پھل پیٹیوں کے حساب سے ہمارے ہاں بھیجتی رہیں۔ دادا کے سوا سب کو امید تھی کہ ایسے نامقبول اور بےرابطہ آدمی کی زندگی تو خیر تھی ہی، موت بھی بڑی پُھسپُھسی ہو گی؛

مجال ہے جو گھروالوں کے سوا کوئی آنکھ نم ہو جائے۔ مگر نواب صاحب نے تو مر کے سبھی کو حیران اور اکثر کو شرمندہ کر دیا۔

بتاتے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کا انتقال ہوا اور کہیں عصر کے بعد جا کے دفن کرنے کی نوبت آئی۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے، کیسی کیسی سواریوں پر اور پیدل، کس کس شکل و صورت اور حلیے کے لوگ آنا شروع ہوے ہیں کہ سڑک کا تو ذکر ہی کیا تمام ذیلی راستے اور گلیاں میلے کچیلے کپڑے والوں، دھول بھرے بالوں اور پسینے میں شرابور چہرے والوں سے، اور برہنہ پا لوگوں سے بھر گئیں۔ ان میں کئی مذہبوں مسلکوں کے لوگ تھے اور سب اپنے اپنے طریق پر نواب صاحب کی نجات کی دعا کرنے آئے تھے۔ یہ سبھی پہلی بار اجالے میں اس بڑی سڑک پر آئے تھے اور دن کی تیز روشنی میں آنکھیں پَٹ پٹّا رہے تھے، کیوں کہ سب وہ لوگ تھے جو مکان کے پچھلے دروازے پر رات کے اندھیرے میں آتے تھے اور مہینے میں جب بھی ضرورت پڑتی تھی اپنی پنشن لے جاتے تھے۔

نواب صاحب کی اس چوری چھپے کی کارروائی میں صرف ان کی بیگم اور نوکر ان کے ہم راز تھے۔

آج ان کو گزرے کوئی پینتالیس پچاس برس ہو گئے ہیں۔ جب بھی بھولے بسرے زمانے کے اس بھلے مانس کو یاد کرتا ہوں، ذہن میں تصویر بنتی ہے تو یہی کہ مِراق کی حد تک صفائی پسند نواب صاحب گِھسی ہوئی بےداغ نیم آستین، تہ بند اور کھڑاویں پہنے بہت سے میلے کچیلے، پِٹے ہوے اور محروم لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں اور کنجوسی کے ساتھ مسکراتے ہوے مٹھیاں بھر بھر کے سکّے اور نوٹ اچھال رہے ہیں۔

۲

دیوان جی کا پورا نام لوگوں کو یاد نہیں رہتا تھا۔ شرافت، نجابت یا سخاوت علی خاں جیسا کوئی شان دار نام تھا۔ محلّے کے چند ہی لوگوں کو یہ نام یاد رہتا ہو گا، مگر وہ گِنتی کے لوگ بھی انھیں دیوان جی کہہ کر پکارتے تھے۔

پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہوے دیوان جی کو اتنا طویل عرصہ گزر

چکا تھا کہ لگتا تھا دیوان جی ہمیشہ سے ریٹائرڈ حوالدار ہیں؛ یعنی اس عہدے کا نام ہی ریٹائرڈ حوالداری ہے جس پر دیوان جی بیس تیس برس فائز رہے اور اب اتنے ہی عرصے سے پنشن وصول کر رہے ہیں۔

بہت قریب کے پڑوسیوں کو، یعنی جن سے ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی، دیوان جی اپنی وردی پہنی ہوئی ایک تصویر بھی دکھایا کرتے تھے۔ حقیقی زندگی کی طرح وردی والی تصویر میں بھی دیوان جی کی ناک پر وہی غصہ لہریں لیتا نظر آتا تھا جو وردی اترنے کے بعد برسوں سے لوگ دیکھ رہے تھے، اور امید کرتے تھے کہ ساری زندگی دیکھتے رہیں گے۔ جھنجھلاہٹ اور چڑھی ہوئی تیوریوں کے بغیر دیوان جی کو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

دیوان جی چند ہی لوگوں کا لحاظ کرتے تھے۔ لحاظ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ تلخی، چڑچڑاہٹ اور دشنام کے بغیر گنتی ہی کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے تھا جن سے دیوان جی درشت لہجے میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تو کوئی فقرہ مسکرا کر بھی کہہ دیا کرتے تھے؛ ہرچندکہ یہ مسکراہٹ والا فقرہ کسی دوسرے کی شان میں ناملائم ریمارک کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔

دیوان جی بالکل تنہا آدمی تھے۔ بےاولاد تھے، اور اہلیہ انتقال کر چکی تھیں۔ رشتےداروں کو، بہ قولِ خود، وہ منھ نہیں لگاتے تھے۔ گویا نوکری اور بیوی سے فراغت نصیب ہونے کے بعد اب ان کی واحد مصروفیت کِریانے کی وہ چھوٹی سی دکان تھی جو عام لوگوں میں دیوان جی کی کیبن کے نام سے مشہور تھی۔ ہماری کالونی کے آدھے میل کے دائرے میں کوئی اَور دکان ہوتی تو دیوان جی کی کیبن کبھی کی بند ہو چکی ہوتی۔ کیوں‌کہ دور دور تک کوئی اَور دکان نہیں تھی اس لیے لوگ بہ درجۂ مجبوری دیوان جی سے سودا خریدتے تھے۔

دیوان جی کی کیبن کے چلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر چیز صاف ستھری خالص بیچتے تھے۔ چیزوں کے مناسب دام مقرر کرنے کے بعد اگر کوئی کم کرنے کو کہتا تھا تو دیوان جی ذاتی طور پر مشتعل ہو جاتے تھے۔ یہ ذاتی اشتعال اس عمومی غصّے سے الگ اور شدیدتر ہوتا تھا جس کا سامنا تو ہر ایک کرتا ہی رہتا تھا۔

میرے گھر کی ایک دیوار دیوان شرافت، نجابت، سخاوت علی خاں کی کیبن سے بالکل مِلی ہوئی تھی، اور دن اور رات کے ان حصوں میں جب کیبن کھلی ہوتی، میں اور میرے گھر والے دیوان جی کے غصہ ہونے کی آواز سنتے رہتے تھے۔ کسی نے کم پیسے دیے، کوئی سودا ادھار مانگ بیٹھا یا خریدے ہوئے سودے کی برائی کر بیٹھا، تو سمجھیے ہلچل مچ جاتی تھی۔ بہت کم گاہک ایسے تھے جنھوں نے برسوں کے پھیلاؤ میں دیوان جی پر گراں فروشی کا الزام لگایا ہو۔ اگر کسی نے مغالطے میں کہہ بھی دیا ہو گا کہ دیوان جی فلاں چیز مہنگی بیچ رہے ہو تو اس نے جلد یا بہ دیر دیوان جی سے معذرت کر لی ہو گی۔

دیوان جی مہنگا بیچنے، کم تولنے یا سودے میں ملاوٹ کرنے کی طرح، معذرت کو بھی ناپسندیدہ عمل سمجھتے تھے۔ کسی نے کبھی انھیں معذرت کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ ان کا مشہور قول تھا کہ یہاں ہم وہ کام ہی ناں کرتے جس پر شرمندہ ہونا پڑے۔ مگر مجھے، اور دوردراز کے محلے میں رہنے والے کم سے کم دو انسانوں کو، معلوم تھا کہ دیوان جی نے زندگی میں ایک بار ضرور معذرت کی ہے۔

برساتوں کے دن تھے۔ ایک رات کوئی گیارہ کے بعد کسی نے دستک دی۔ میں نے جا کر دیکھا کہ دیوان جی چھتری تانے دروازے پر کھڑے ہیں۔ چہرہ بارش کے پانی سے دھلا ہوا یا پسینے میں شرابور ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: "ساتھ چلیے۔ ایک تماشا ہو گیا ہے۔"

یااللہ خیر! کوئی بات بہت ہی غیرمعمولی ہوئی ہے، ورنہ یہ صاحب اس طرح کسی کو اپنا ساتھ دینے کے لیے نہیں کہتے۔ میں برساتی اوڑھ کر ساتھ ہو لیا۔ سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد بولے: "خفّت کی بات ہے۔ میں آپ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں، اس مارے لیے چلتا ہوں۔"

میں نے تفصیل نہیں پوچھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے علم تھا وہ مناسب وقت پر خود بتا دیں گے۔

تقریباً ایک میل ناہموار میدانوں، اندھیری سڑکوں، گلیوں سے گزارتے ہوئے مجھے ریلوے پھاٹک کے قریب بنے کچے پکے مکانوں کے جمگھٹے کے پاس لے گئے۔ ایک درخت کی ناکافی پناہ میں مجھے ٹھہرنے کو کہا، اور ریلوے

ملازمین کے ان مکانوں میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اندھیرے میں کسی کے قہقہہ مار کر ہنسنے اور دیوان جی کے خفا ہونے کی آواز آئی۔ دیوان جی کے ساتھ دو آدمی آ رہے تھے۔ قریب آئے تو دیکھا ان میں ایک بارہ چودہ برس کا لڑکا ہے۔ لڑکا نیند میں تھا اور آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی آواز میں ہنس رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں دیوان جی اس وقت زیادہ غصے میں نہیں تھے، ورنہ جس انداز میں وہ شخص ہنس رہا تھا اسے دیکھتے ہوے خدشہ تھا کہ دیوان جی کے ہاتھوں پِٹ جائے گا۔

خیر، وہ آدمی ذرا سنبھلا، سنجیدہ ہوا، تو دیوان جی کہنے لگے: "شام کو یہ لڑکا سودا لینے آیا تھا۔ میں نے حساب کر کے پیسے لوٹائے تو ایک روپے کا یہ نوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کے ڈبّوں بوروں کے بیچ گر گیا۔ نہ میں نے دیکھا نہ اس نے۔ یہ بولا آپ نے ایک رُپیا کم دیا ہے دیوان جی۔ میں نے کہا بکواس کرتا ہے بے۔ خیر یہ بھی ضئی تھا، میں بھی ضئی تھا۔ تو بھائی میں نے اس کو چور بنا کے لوٹا دیا۔ ابھی شام کو دکان کا سامان سمیٹنے لگا تو نیچے پڑا ہوا یہ نوٹ مل گیا۔ لے بھئی لڑکے یہ اپنا نوٹ سنبھال۔ تو سمجھے صاحب، لڑکا چور نہیں ہے۔ میں نے ہی جَھک ماری تھی۔ آؤ بھائی چلو۔"

لڑکے کا باپ پھر ہنسا۔ کہنے لگا: "کوئی بات نہیں دیوان جی، کوئی بات نہیں۔"

دیوان جی کو جیسے دورہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے دہاڑے: "بات کیسے نہیں ہے بے؟ میں بستر پے لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ گواہی کے لیے ایک بَھلے آدمی کو اتنی دور بارش میں پیدل چلا کے لایا ہوں۔ خفّت الگ ہوئی۔-- تُو اپنے اس لڑکے کو سمجھا دے یہ پھر میری دکان پے ناں آوے۔ نہیں تو ٹانگیں چھانٹ دوں گا۔ ہاں۔ پیسے سنبھالنا بھی نہیں آتا باؤلے کو۔"

٣

ہم ادب کے طالبِ علم تھے، اور ہیں۔ اُس زمانے میں نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا، اس لیے گھوم پھر کر نظموں میں اور زندگی میں ہم کہانیوں جیسے کردار تلاش کرنے لگتے تھے۔ ہمیں، ہمارے دوستوں کو، مغرب سے آنے والی ادبی تحریکوں میں اور سیّاحوں میں بڑی دلآویزی محسوس ہوتی تھی؛

چناں چہ جب اپنے شہر کی سڑکوں پہ ہم نے پیدل ولندیزی صاحب کو دیکھا تو نہ صرف پوری طرح متوجّہ ہو گئے بلکہ سب دوستوں نے چندہ کر کے انھیں کافی ہاؤس میں چائے کی دعوت بھی دے دی۔

پیدل ولندیزی کا اصل نام جان واوڈا تھا۔ پہلی ملاقات میں انھوں نے ہمیں اپنا سونےوالاتھیلا یعنی سلیپنگ بَیگ پہن اوڑھ کر دکھایا، اپنی زَنبیل دیکھنے کو دی، اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں وہ ہمیں اپنی انگریزی نظمیں بھی سنائیں گے۔

وہ بڑی چٹک مٹک باتیں کرتے تھے، حالاں کہ اب جتنی ہماری عمر ہے اس سے وہ دو برس بڑے تھے، جو ظاہر ہے ہمیں اس زمانے میں متقدّمین کی عمر لگتی ہو گی۔ ہمیں بہت حیرت ہوتی تھی کہ پیدل ولندیزی پیادہ پا دنیا کا سفر کر رہے ہیں اور گٹھیا، وجعِ مفاصل، عرق النّسا اور بعض اعصابی بیماریوں کا تذکرہ کرنے کے بجائے ڈچ لوک گیت اور لطیفے سناتے ہیں، اور اچّھے، بلکہ کم اچھے لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔

دوسری بار ہم نے پیدل ولندیزی کو ٹورِسٹوں والے ہوٹل میں چار کورس کا باضابطہ ڈنر دیا۔ خود ہم دوستوں نے اپنے لیے مکھن لگے دو دو ٹوسٹ اور بِنا کریم کی کافی منگائی۔ ولندیزی کو سمجھا دیا کہ ہم چاروں نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا ہے، اس وقت کچھ ہلکا ہی کھائیں گے؛ تم کھانا کھاؤ، ہم بس کافی اور ٹوسٹ لیں گے۔

پیدل ولندیزی ہماری وضاحت پر مسکرا کر چپ ہو گئے۔ انھیں ہم طالب علموں کی مالی حیثیت کا اندازہ ہو گا۔ پھر یہ بھی تھا کہ پیدل ولندیزی جان واوڈا جھوٹ بولنے والوں میں خود بھی استاد کا درجہ رکھتے تھے؛ اتنی رعایت تو ہمیں دیتے ہی۔

اگلی چند ملاقاتوں میں انھوں نے ہمیں اتنی بہت سی فرضی اور حقیقی مہمّات کے قصّے سنائے کہ ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ واقعہ کہاں تک ہے اور تخیّل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بعض واقعات تو سرتاسر افسانہ معلوم ہوتے تھے؛ مگر یہ سنانے والے کا کمال تھا کہ پلک تک نہیں جھپکنے دیتا تھا۔

ہم سے داد وصول کرنے کی نیت سے، یا اپنے جوشِ بیان میں، کبھی

کبھی وہ اپنی جھوٹ اور عیّاری کا کوئی اصل واقعہ بھی سنا دیتے۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے اور منہ پر نیپکن رکھ کر شانے اچکاتے ہوئے دیر تک بےآواز ہنستے رہتے۔ اپنی ایک عیّاری کا ذکر وہ بہت شوق سے کرتے تھے کہ کس طرح انڈونیشیا کے شہر جکارتا سے ایک سال جنوری کے مہینے میں وہ اپنے مدّاحوں اور میونسپل نمائندوں سے پھولوں کے ہار پہن کر روانہ ہوئے۔ شہر سے سترہ میل دور ایک نیک دل کسان کے گھر کافی پینے رکے۔ پھر کچھ ایسا ہو گیا کہ اگلے سال جنوری تک پیدل ولندیزی اسی کسان کے وہاں ٹھہرے رہے۔ وہ اس کے ٹرک اور ٹریکٹر کی دیکھ بھال کرتے، اسے اپنی مہمّات کے قصے سناتے، اور بدلے میں تین وقت کا کھانا اور جو بھی کسان کے اور ان کے نصیب میں ہوتا پاتے رہے۔ دوسرے سال کی جنوری ختم ہونے سے پہلے پیدل ولندیزی نے پھر جکارتا کی طرف منہ کیا۔ سترہ میل پیدل چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور اپنے پچھلے برس کے مدّاحوں سے دوبارہ ہارپھول پہن لیے۔ پھر وہ کئی ماہ تک جکارتا والوں کو اپنے جنوری سے جنوری تک کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سناتے رہے۔

ایک بار وہ ہم سے الوداعی ڈنر لے کر اور خود اپنے بیان کے مطابق ایک بحری جہاز میں لفٹ لے کر آسٹریلیا روانہ ہو گئے۔ آٹھ ماہ وہاں رہنے کے بعد لوٹے تو بہت نڈھال اور کجلائے ہوئے تھے۔ آسٹریلیا کا موسم اِس بار انھیں راس نہیں آیا تھا۔ کسی نے اڑا دیا کہ پچھلے چھ ماہ میں کتنی ہی بار ہم نے اپنی آنکھوں سے پیدل ولندیزی جان واوڈا کو اِدھر، اپنے ابراہیم حیدری وِلیج میں، مچھیروں کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہے۔

ہم پھر چندہ کر کے پیدل ولندیزی صاحب کو استقبالیہ ڈنر دے رہے تھے۔ کسی نے ابراہیم حیدری والی بات دُہرانا چاہی۔ ہم لوگوں نے پہلے ہی جملے پر اسے روک دیا۔ ہمیں رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کی، اور پیدل ولندیزی کو مناسب قوّت بخش غذا کی ضرورت تھی۔ یقین کیجیے، اس پورے انتظام میں عینی شاہدوں اور حلف اٹھوانے والوں کی کہیں کھپت نہیں تھی۔

پیدل ولندیزی صاحب تو ہمارے گروپ کے میر باقر علی داستان گو تھے۔ ان میں اور خلدآشیانی میر باقر میں محض اسلوب کا فرق تھا، یعنی یہ

کہ ولندیزی صاحب ہر کہانی کے ہیرو یا تو خود ہوتے تھے یا ہیرو کے دائیں ہاتھ پر ایک سونٹی لیے بہ ذاتِ خود کھڑے ہوتے تھے اور اسے مناسب مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ خدا معلوم جان واوڈا صاحب اب کہاں ہیں۔ اگر زندہ ہوں گے تو شاید بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ اور ہو سکتا ہے نہ بھی ہوئے ہوں۔

نیّر مسعود

اہرام کا میرمحاسِب

بڑے اہرام کی دیواروں پر فرعون کا نام اور اس کی تعریفیں کندہ ہیں۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس عمارت کو فرعون نے بنوایا ہے۔ لیکن اس سے ایک بدیہی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ فرعون کا نام اور اس کی تعریفیں کندہ ہونے سے پہلے اہرام کی تعمیر مکمّل ہو چکی تھی۔ مگر کتنے پہلے؟ چند ماہ؟ یا چند سال؟ یا چند صدیاں؟ یا چند ہزار سال؟ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اہرام کی عمارت فرعون سے بیس ہزار سال پہلے بھی موجود تھی تو اس دعوے کی تردید میں اس کے سوا کوئی دلیل نہ ہو گی کہ اہرام پر فرعون کا نام کندہ ہے؛ لیکن یہی دلیل اس کا ثبوت ہو گی کہ نام کندہ ہوتے وقت یہ عمارت بنی ہوئی موجود تھی۔ کب سے بنی ہوئی موجود تھی؟ اس سوال کا جواب دینے سے مورّخ بھی قاصر ہیں اور تعمیرات کے ماہر بھی؛ مورّخ اس لیے کہ ان کے پاس اہرام کی تعمیر کی دستاویزیں نہیں ہیں، اور ماہر اس لیے کہ ان کے پاس اہرام کی عمر کا پتا لگانے والے آلات نہیں ہیں۔ ان کے ترقی یافتہ آلات نہ یہ بتا سکے ہیں کہ اہرام اپنی کتنی عمر گزار چکا ہے، اور نہ یہ بتا سکے ہیں کہ ابھی اہرام کی کتنی عمر باقی ہے۔ البتّہ یہ آلات ماضی اور مستقبل دونوں سمتوں میں اہرام کے بہت طویل سفر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

تعمیرات کے ماہروں نے یہ تخمینہ ضرور لگا لیا ہے کہ اہرام کے اطراف کی زمینوں اور خود اہرام کی عمارت کے رقبے کے لحاظ سے اس کے بنانے میں زیادہ سے زیادہ کتنے آدمی ایک ساتھ لگ سکتے تھے، اور یہ زیادہ سے زیادہ آدمی کم سے کم کتنی مدّت میں اہرام کو مکمّل کر سکتے تھے؛ اور یہ مدّت کئی سو سال کو پہنچتی ہے۔

لیکن خلیفہ کے وقت میں اہرام کی ایک سِل پر یہ عبارت کندہ پائی گئی:

"ہم نے اسے چھ مہینے میں بنایا ہے، کوئی اسے چھ مہینے میں توڑ کر تو دکھا دے۔"

خلیفہ کو غصہ آنا ہی تھا۔ مزدور بھرتی ہوئے اور اہرام پر ایک طرف سے کدالیں چلنا شروع ہوئیں۔ مگر ہُوا صرف یہ کہ کدالوں کی نوکیں ٹوٹ گئیں اور پتھروں سے چنگاریاں سی اُڑ کر رہ گئیں۔ خلیفہ کو اور غصہ آیا۔ اُس نے اہرام کے پتھروں کو آگ سے گرم کرایا۔ جب پتھر خوب تپنے لگے تو اُن پر ٹھنڈا ٹھنڈا سرکہ پھینکا گیا۔ چَٹ چَٹ کی آواز آئی اور پتھروں میں پتلی پتلی لکیریں کھُل گئیں۔ ان لکیروں پر نئی کدالیں پڑنا شروع ہوئیں اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے الگ ہونے لگے۔ خلیفہ کو تسلّی ہوئی اور وہ دارالخلافے کو لوٹ گیا۔ اُس کے پیچھے یہ حکم رہ گیا کہ چھ مہینے تک دن رات میں کسی بھی وقت کام روکا نہ جائے۔

* * * *

چھٹا مہینا ختم ہوتے ہوتے خلیفہ پھر اپنے امیروں کے ساتھ اہرام کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اتنے دن میں اہرام سے صرف ایک چھوٹی دیوار بھر پتھر الگ کیے جا سکے تھے۔ ان پتھروں کے پیچھے ایک طاق نمودار ہوا تھا جس میں پتھر کا تراشا ہوا ایک مرتبان رکھا تھا۔ مرتبان خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور خلیفہ نے اسے خالی کرایا تو اُس میں سے پرانی وضعوں کے سونے کے زیور اور قیمتی پتھر نکلے۔ پھر دیکھا گیا کہ پتھر کے مرتبان پر بھی ایک عبارت کندہ ہے، اور خلیفہ کے حکم سے یہ عبارت پڑھی گئی:

"تو تم اسے نہیں توڑ سکے۔ اپنے کام کی اُجرت لو اور واپس جاؤ۔"

اُس وقت خلیفہ طاق کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے پیچھے اہرام کا مخروطی سایہ بیابان میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ خلیفہ مُڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا جہاں اہرام کا سایہ ختم ہو رہا تھا۔ خلیفہ تھوڑا اور آگے بڑھ کر رکا۔ اب زمین پر اُس کا بھی سایہ نظر آنے لگا۔ بیابان کی دھوپ میں صرف سائے کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلیفہ اہرام کی چوٹی پر کھڑا ہے۔ لیکن اہرام کی چوٹی پر کوئی نہیں تھا۔ خلیفہ واپس آ کر

پھر طاق کے سامنے کھڑا ہوا، اور اب اس نے حکم لکھوایا کہ چھ مہینے کی اس مہم کے اخراجات کا مکمل حساب پیش کیا جائے۔ اس نے ایک اور حکم لکھوایا کہ مرتبان سے نکلنے والے خزانے کی قیمت کا صحیح صحیح تخمینہ لگایا جائے۔

مشہور ہے کہ خزانے کی قیمت ٹھیک اُس رقم کے برابر نکلی جو اہرام کا طاق کھولنے کی مہم پر لگی تھی۔ اور اس میں -- ایسی بات مشہور ہو جانے میں -- کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ یہ بات حسابات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشہور ہو گئی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پورے معاملے میں وہ میرمحاسِب فراموش کر دیا گیا جس کے ذمّے یہ دونوں حساب کتاب تھے۔

* * * *

اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ خلیفہ کی مملکت میں ریت کے ذرّوں تک کا شمار رکھتا ہے۔ حساب کی فَردوں کے پلندے اس کے آگے رکھے جاتے اور وہ ایک نظر میں ان کے میزان کا اندازہ کر لیتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جمع تفریق کی غلطیاں اپنےآپ کاغذ پر سے اُچھل کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے لوگ خلیفہ سے زیادہ اس کے میرمحاسب سے خوف زدہ رہتے تھے۔ دارالخلافے کے لوگ ایک دوسرے کو، کبھی ہنسانے کے لیے، کبھی ڈرانے کے لیے، بتاتے تھے کہ میرمحاسب کے دل میں جذبوں کی جگہ، اور اس کے دماغ میں خیالوں کی جگہ، اعداد بھرے ہوے ہیں۔ اور یہ بات -- بلکہ وہ بات جس کی طرف یہ بات اشارہ کرتی ہے -- کچھ بہت غلط بھی نہیں تھی، کم سے کم اُس حساب کی رات تک۔

اُس رات اس کے سامنے دونوں حسابوں کی فَردیں کھلی رکھی تھیں اور اس نے ایک نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ دونوں حساب قریب قریب برابر ہیں۔ تاہم اس نے ضروری سمجھا کہ دونوں فردوں کی ایک ایک مَد کو غور سے دیکھ لے۔ اس کے مستعد ماتحتوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اندراجات کیے تھے۔ کسی بھی مد کی رقم میں کوئی کمی بیشی نہیں تھی۔ حاصل جمع نکالنے کے لیے اس نے مرتبان والے خزانے کی فرد پہلے اٹھائی۔ لیکن جب وہ حاصل

جمع لکھنے لگا تو اس کا قلم رکا اور اسے محسوس ہوا کہ اس نے جوڑنے میں کہیں غلطی کر دی ہے۔ اس نے پھر حساب جوڑا اور دیکھا کہ اب حاصل جمع کچھ اَور ہے، لیکن اس کو پھر غلطی کر جانے کا احساس ہوا اور اس نے پھر حساب جوڑا اور حاصل جمع کو کچھ اَور ہی پایا۔ آخر اُس فرد کو ایک طرف رکھ کر اس نے طاق کھلنے کی مہم والی فرد اٹھائی، مگر یوں جیسے اپنے کسی شُبہے کی تصدیق چاہتا ہو۔ اور واقعی اُس فرد کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اُس کے سامنے دو فردیں اور چھ سات، یا اَور زیادہ، حاصل جمع تھے۔ الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ، فردوں کو یوں ہی چھوڑ کر، وہ باہر نکل آیا۔ کوئی سوال اس کو پریشان کر رہا تھا۔ کوئی سوال اس تک پہنچنا چاہتا تھا، لیکن اعداد کے ہجوم میں اسے راستا نہیں مل رہا تھا۔

باہر چاندنی میں کھڑے کھڑے جب اس کے پاؤں شل ہونے لگے اور ہتھیلیوں میں خون اتر آیا تب اُسے احساس ہوا کہ اعداد کا ہجوم اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دور ہوتے ہوئے اعداد اسے انسانوں کی ٹولیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ دو اور دو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ان کا حاصل جمع، جسے وہ پہچان نہیں پایا کہ چار ہے یا کچھ اَور۔ اِس آخری ٹولی کے گزر جانے کے بعد وہ اندر واپس آیا۔ اس نے دونوں فردوں کو تلےاوپر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ ان کا حاصل جمع ایک نکلے گا یا الگ الگ؟ پھر سوچنے لگا کہ خود وہ دونوں کو ایک چاہتا ہے یا الگ الگ؟ اور پھر یہ کہ خلیفہ کیا چاہتا ہے؟ تب اچانک اس کو پتا چلا کہ یہی وہ سوال ہے جو اعداد کے ہجوم میں راستا ڈھونڈھ رہا تھا: خلیفہ کیا چاہتا ہے؟

باقی ماندہ رات اس نے یہی سوچتے ہوئے گزار دی کہ خلیفہ کیا چاہتا ہے۔

صبح ہوتے اُسے نیند آ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ خلیفہ اور فرعون ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اہرام کی پرچھائیں کے سرے کی طرف جا رہے ہیں اور اہرام کی چوٹی پر کوئی نہیں ہے۔ اُس نے سوتے ہی میں سمجھ لیا کہ خواب دیکھ رہا ہے، اور اپنی آنکھ کھل جانے دی۔

دن ڈھل رہا تھا جب اُس نے دونوں فردوں کو جلا کر راکھ کیا، اپنے

ایک غلام کا خچّر کسا، غلام ہی کی پوشاک پہنی اور باہر نکلا۔ بازاروں میں بےفکرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ٹولیاں بنائے، گشت کر رہے تھے۔ اُس دن شہر میں گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا۔ سب ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ طاق کھولنے کی مہم پر صَرف ہونے والی رقم اور مرتبان کے خزانے کی قیمت میں ایک جَو کا فرق بھی نہیں نکلا ہے، اور یہ کہ یہ حساب میرمحاسب کا نکالا ہوا ہے جو خلیفہ کی مملکت میں ریت کے ذرّوں تک کا شمار رکھتا ہے۔

* * * *

وہ واپس لوٹنے کے لیے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے خچّر کو ایڑ لگائی، بازاروں کو پیچھے چھوڑا اور خود کو اُس بیابان میں گم کر دیا جہاں ہوا میں ریت کے ذرے چنگاریوں کی طرح اُڑتے ہیں اور زمین پر اہرام اپنا مخروطی سایہ ڈالتا ہے۔

نیّر مسعود

نُدبہ

۱

میں نے بےحاصل مشغلوں میں زندگی گزاری ہے۔ اب اپنا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گزارتا ہوں کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ یہ میرا نیا، اور شاید آخری، اور شاید سب سے بےحاصل مشغلہ ہے۔

برسوں تک میں ملک میں اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرا۔ مقصد شاید یہ تھا کہ اپنے چھوٹے بڑے شہروں سے واقفیت بڑھاؤں، لیکن ان دوروں کا حاصل یہ نکلا کہ مجھے اپنے شہر کے سوا سب شہر ایک سے معلوم ہونے لگے اور میں اپنے شہر واپس آ کر کئی مہینے تک گوشہ نشین رہا۔ پھر میرا دل گھبرایا اور میں پھر نکل کھڑا ہوا۔ اب کی بار میرا رخ دیہاتی آبادیوں کی طرف تھا۔ لیکن بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آبادیاں شہری آبادیوں سے کچھ بہت مختلف نہیں ہیں، یا کم سے کم مجھ کو مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ میں واپس لوٹ آیا اور بہت دنوں تک اِس وہم میں گرفتار رہا کہ چیزوں میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں۔ میں اس وہم کو دل میں لیے رہا اور کوشش کرتا رہا کہ میری کسی بات سے اس کا اظہار نہ ہونے پائے، لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے روز کے ملنے والے مجھ کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگے ہیں تو میں نے پھر مسافرت اختیار کی۔

اِس مسافرت میں ایک عرصے تک مَیں اپنی قدیم سرزمین کے اُجاڑ علاقوں میں گھومتا پھرا۔ ان علاقوں کے موسم سخت اور مٹی خراب تھی؛ دریا ان سے دور پڑتے تھے اور زیادہ ضرورتوں والے انسانوں کا وہاں بسنا ممکن نہ تھا، پھر بھی یہ علاقے انسانوں سے خالی نہ تھے۔ میں ایسے علاقوں

سے بھی ہو کر گزرا جنھیں انسان نے شاید کبھی اپنا مسکن نہیں بنایا تھا، لیکن یہ محض بڑے بڑے غیرآباد جغرافیائی خطّے تھے جو کسی مبہم انداز میں سمندروں سے مشابہ تھے اور غیرآباد ہونے کے باوجود اُجاڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اجاڑ علاقے وہ تھے جنھیں انسانوں نے قدیم زمانوں سے آباد کر رکھا تھا۔ یہ علاقے اُن جغرافیائی خطّوں سے گزرتے میں کسی ٹاپو کی طرح اچانک مل جاتے تھے اور شاید انسانوں ہی کے آباد ہونے سے اُجاڑ معلوم ہوتے تھے۔ اور جس طرح یہ انسان اپنے علاقوں پر اثر ڈالتے تھے اُسی طرح وہ علاقے بھی اپنے باسیوں پر ایسا اثر ڈالتے تھے کہ انھیں بَھرےپُرے شہروں میں بھی دیکھ کر پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ اُجاڑ علاقوں سے آ رہے ہیں۔ کم سے کم مَیں انھیں پہچان سکتا تھا اس لیے کہ میری اِس مسافرت کا زیادہ زمانہ انھیں باسیوں کے درمیان گھومتے پھرتے گزرا۔

یہ چھوٹی چھوٹی برادریاں تھیں اور ہر برادری دوسری برادری سے مختلف تھی، یا کم سے کم مجھ کو مختلف معلوم ہوتی تھی۔ ان برادریوں کو دیکھنا اور کچھ کچھ دن ان کے ساتھ گزارنا اس مسافرت میں میرا مشغلہ تھا۔ اس مشغلے میں مجھے زیادہ انہماک اس لیے تھا کہ انسانوں کے یہ منتشر گروہ ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ کوئی اچانک وبا، یا موسم کی کوئی بڑی تبدیلی ان کو آسانی سے مِٹا سکتی تھی، اور مِٹا دیتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی برادری میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب میں دوبارہ اس کے علاقے سے گزرا تو میں نے دیکھا اب وہاں کوئی نہیں ہے اور وہ علاقہ کسی غیرآباد جغرافیائی خطّے میں قریب قریب گم ہو چکا ہے، اس لیے کہ ان برادریوں کی نشانیاں بہت جلد مِٹتی تھیں، یا شاید ہوتی ہی نہیں تھیں۔

میں ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکا، اس لیے کہ اگرچہ میری زبان وہ کچھ کچھ سمجھ لیتے تھے لیکن اُن کی بولیاں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور ہماری زیادہ گفتگو اشاروں میں ہوتی تھی۔ لیکن اس نے بھی مجھے کچھ بہت فائدہ نہیں دیا اس لیے کہ الگ الگ برادریوں کے الگ الگ اشارے ہوتے تھے اور کبھی کبھی ایک ہی اشارہ دو برادریوں میں ایک دوسرے کے بالکل برخلاف معنی دیتا تھا۔ ایک برادری خوشی کے اظہار میں جس طرح ہاتھوں کو پھیلاتی تھی دوسری اسی طرح

غم کے اظہار میں پھیلاتی تھی؛ ایک برادری سر کی جس جنبش سے کسی بات کا اقرار کرتی تھی دوسری اسی جنبش سے انکار ظاہر کرتی تھی۔ ان کے اشاروں کو صحیح صحیح سمجھنے کے لیے وقت چاہیے تھا اور مَیں کسی ایک برادری میں زیادہ ٹِکتا نہیں تھا اس لیے اشاروں کی مدد سے جو کچھ میں نے اپنے نزدیک معلوم کیا اس کا کوئی بھروسا نہ تھا اور میں نے اس اُلٹی سیدھی معلومات کو واپس لوٹنے سے پہلے ہی بُھلا دیا۔ جو کچھ مجھے یاد رہ گیا وہ ان برادریوں کا نُدبہ تھا جو ہر جگہ مختلف ہوتا پھر بھی ہر جگہ میری پہچان میں آ جاتا تھا۔

* * * *

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض اتفاق تھا یا ان لوگوں میں مَوتیں زیادہ ہوتی تھیں لیکن بہت سی برادریوں میں میرے پہنچنے کے دوسرے ہی تیسرے دن کوئی نہ کوئی موت ضرور ہوئی جس کا اعلان مرنے والے کے قریب ترین رشتہ داروں، یا ان رشتہ داروں کے قریب ترین رشتہ داروں، کے چیخنے یا رونے سے ہوتا تھا۔ برادری والے ان سوگواروں کے پاس خاموشی کے ساتھ آتے اور انھیں چپ کرا کے خاموشی کے ساتھ واپس چلے جاتے تھے۔ کچھ لوگ میّت کو ٹھکانے لگانے کے بندوبست میں لگ جاتے۔ یہ بندوبست مکمّل کر کے کہیں میّت کو ٹھکانے لگانے کے بعد اور کہیں اس سے پہلے ہی سب مل کر نُدبہ کرتے جس کے لیے باقاعدہ مقام اور وقت مقرر ہوتا تھا۔ زیادہ تر برادریوں کا نُدبہ فریادی لہجے میں موت کی شکایت سے شروع ہو کر مرنے والے کی یاد تک پہنچتا، پھر اس میں تیزی آنے لگتی۔ اور جب نُدبہ پورے عروج پر آتا تو سب پر ایک جوش طاری ہو جاتا اور اُن کے بدنوں کی جنبشوں، اور ان کی آوازوں، اور سب سے بڑھ کر ان کی آنکھوں سے غم کے بجائے غصّے کا اظہار ہونے لگتا اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ سب نے کوئی تیز نشہ استعمال کر لیا ہے۔ کہیں کہیں مجھ کو بھی اس رسم میں شریک ہونا پڑتا لیکن مَیں ایسے موقعوں پر جذبوں سے عاری بےعقلی کے ساتھ دوسروں کی بھونڈی نقّالی کرتا رہ جاتا اور نُدبہ ختم بھی ہو جاتا جس کے بعد سب ایک دوسرے کو تسلّی دیتے۔ اس میں مجھے بھی تسلّی دی جاتی

تھی۔

ایک نُدبہ -- آخری نُدبہ -- جو مَیں نے بھی کیا، اُس میں برادری کی عورتوں اور مردوں کی تعداد بالکل برابر رکھی جاتی تھی۔ یہ پہلی اور آخری برادری تھی جس کی عورتوں کو اس رسم کے دوران میں نے بہت قریب سے اور چُھو کر دیکھا۔ ان عورتوں کے قد چھوٹے اور رنگ سانولے تھے۔ اُن کے عورت ہونے کی پہچانیں بنانے میں قدرت نے مبالغے سے کام لیا تھا اور وہ قدیم زمانے کی اُن مورتیوں اور دیواری تصویروں کی اصل معلوم ہوتی تھیں جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اُن لوگوں نے بنائی ہیں جنھوں نے سچ مچ کی عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا، یا قریب سے نہیں دیکھا تھا، اور چُھو کر تو بالکل ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس برادری کا نُدبہ یوں ہوتا تھا کہ ایک قطار میں مرد اور اُن کے رو بہ رو دوسری قطار میں عورتیں ننگی زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھتی تھیں، اور یہ آمنے سامنے والے پہلے ایک دوسرے کی کہنیوں سے کہنیاں ملاتے، پھر کلائیاں ملاتے، پھر ہتھیلیوں پر ہتھیلیاں مارتے اور انگلیاں آپس میں الجھا کر جو کچھ کہنا ہوتا کہتے؛ پھر الگ ہوتے، پھر کہنیاں اور کہنیوں سے کلائیوں تک ملا کر ہتھیلیاں لڑاتے اور انگلیاں الجھا کر بول کہتے۔ اُن کا نُدبہ باربار عروج پر آتا، دھیما پڑتا، پھر عروج پر آتا اور دیکھنے میں سمندر کا جواربھاٹا معلوم ہوتا، یہاں تک کہ سب کی آنکھیں پلٹ جاتیں اور آخر سب پسینے پسینے ہو کر کپکپاتی ہوئی کم زور آوازوں میں نُدبہ ختم کرتے اور آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے الگ ہو جاتے۔

میرے سامنے اس برادری میں تین موتیں ہوئیں۔ پہلی دو موتوں پر نُدبہ کرنے والوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوا، لیکن تیسری موت میرے بوڑھے میزبان کی ہو گئی۔ میں نے اپنے پاس موجود رہنے والی دواؤں سے اس کا علاج بھی کیا تھا لیکن وہ بچ نہ سکا۔ اُس کی صورت ہی نہیں، کئی ادائیں بھی میرے باپ کی یاد دلاتی تھیں اور میں نے اسے، کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے، یہ بات بتانے کی کوشش بھی کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے برادری والوں سے میرے بارے میں کیا باتیں کی تھیں، لیکن اس کے مرنے کے بعد جو لوگ سوگواروں کو چپ کرانے نکلے تھے ان میں سے ایک دو میرے پاس بھی آ گئے، اور اگرچہ میں خاموش تھا لیکن انھوں نے مجھے چپ

کرایا۔ ان کے آنے سے مجھ کو اپنے باپ کی موت کا دن یاد آ گیا۔ اُس دن میرے گھر میں عورتوں کے رونے کا بےہنگم شور تھا اور میں سب سے الگ چپ چاپ بیٹھا رہ گیا تھا۔

میزبان کی موت نے مجھے اپنے باپ کا آخری وقت کا چہرہ یاد دلا دیا۔ پھر مجھے بوڑھے میزبان کی صورت یاد آنے لگی، اور جب اُس کے آخری بندوبست کے بعد برادری کی عورتیں اور مرد آمنے سامنے قطاریں بنانے لگے تو میں خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر اُس علاقے سے متّصل غیرآباد خطّے کی طرف نکل گیا اور وہیں کے وہیں میں نے اپنی مسافرت ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور اُسی دن واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

* * * *

اَب، جیسا کے میں نے بتایا، میرا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گزرتا ہے کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ اس طرح میری زندگی، جس کا بڑا حصہ ناہمواریوں میں نکل گیا، اب ایک مدّت سے بالکل ہموار گزر رہی ہے۔ البتّہ صرف ایک دن اس میں تھوڑی سی ناہمواری آئی تھی۔ یہ ناہمواری شاید میرے ایک مشغلے کا حاصل تھی، لیکن ایسا حاصل جو میں سمجھتا ہوں بےحاصلی سے بھی بدتر تھا۔

۲

اُس دن سویرے سویرے میرے مکان کے اُس دروازے پر دستک دی گئی جو بازار کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے سُستی کے ساتھ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا محلّے کا پاگل لڑکا ہاتھ میں کاغذ کا ایک مُڑاتُڑا پرزہ لیے کھڑا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پُرزہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ اس کی عادت تھی کہ بازار کی گری پڑی چیزیں اٹھاتا اور دوسروں کو بانٹ دیتا تھا۔ اِسے وہ انعام دینا کہتا تھا، اور بازار والے تقاضا کر کر کے اس سے انعام لیا کرتے تھے۔

تو آج مجھے بےمانگے انعام مل گیا، میں نے دروازہ بند کرتے ہوے سوچا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا، جو میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا، کہ اس لڑکے کو پاگل کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اُس میں کوئی غیرمعمولی بات نہیں تھی، سوا اِس کے کہ وہ ہر وقت خوش رہتا اور بات بات پر ہنستا تھا؛ تاہم سب اُس کو پاگل سمجھتے تھے، مَیں بھی سمجھتا تھا۔

کچھ دیر بعد اُسی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پھر دروازہ کھولا۔ پھر وہی لڑکا تھا۔

"بلا رہے ہیں،" اس نے ہنسی روک کر کہا۔

"کون بلا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جو آئے ہیں۔"

"کون آئے ہیں؟"

"پرچے والے،" وہ بولا، زور سے ہنسا اور بھاگ گیا۔

میں نے دروازہ بھیڑ کر پلنگ پر پڑا ہوا پُرزہ اٹھا لیا۔ پُرانا کاغذ تھا اور اس پر میری ہی تحریر میں میرا نام اور پتا لکھا ہوا تھا، اور یہ تحریر اُن زمانوں کی معلوم ہوتی تھی جب میں ہاتھ سنبھال کر اور حرفوں کو خوب صورت بنا کر لکھتا تھا۔ مجھے وہ زمانے یاد آئے۔ یہ بھی یاد آیا کہ انھیں میں سے ایک زمانہ میں نے اُجاڑ علاقوں کی برادریوں میں گھومتے گزارا تھا۔ مجھے یاد نہ آ سکا کہ یہ پرزہ میں نے کب اور کہاں لکھا تھا لیکن یہ ضرور یاد آ گیا کہ اُس زمانے میں کاغذ کے ایسے پرزے میں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ برادریوں میں تقسیم کیے تھے۔ میں اُن کی مہمان نوازیوں کا یہی ایک صلہ دیتا تھا۔ میں یہ تاکید بھی کر دیتا تھا، زیادہ تر غلط سلط اشاروں کی زبان میں، کہ اگر کسی کو کبھی شہر میں کوئی کام آ پڑے تو میری تحریر کی مدد سے سیدھا میرے پاس پہنچ جائے۔ میں جانتا تھا کہ اپنی اِن تحریروں میں سے کوئی بھی مجھے پھر دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ لیکن اِس وقت، اتنے زمانے کے بعد، ایک، تحریر کا پُرزہ میرے ہاتھ میں تھا؛ اور اگرچہ اطلاع دینے والا وہ تھا جس کو سب کے ساتھ مَیں بھی پاگل سمجھتا تھا، مگر مجھے اطلاع ملی تھی کہ کچھ لوگ اِس پرزے کی مدد سے مجھ تک پہنچ گئے ہیں

اور مجھے بُلوا رہے ہیں۔ چند لمحوں کے اندر میری دیکھی ہوئی ساری برادریاں خواب کے خاکوں کی طرح میرے ذہن میں گھوم کر غائب ہو گئیں اور میں گھر سے نکل کر بازار میں آ گیا۔

* * * *

دُکانیں کھلنے کا وقت ہو گیا تھا لیکن زیادہ تر دکانیں بند پڑی تھیں۔ دُکان دار البتہ موجود تھے اور ایک ٹولی بنائے ہوئے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر سب میری طرف بڑھ آئے۔

"یہ کون لایا ہے؟" میں نے پُرزہ انھیں دکھا کر پوچھا۔

انھوں نے کچھ کہے بغیر شمال کی طرف اترنے والی اُس بےنام کچی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دہانے کو بازار کے کوڑاگھر نے قریب قریب بند کر دیا تھا۔ میں نے اُس طرف دیکھا۔ ایک نظر میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوڑاگھر کی حد سے باہر تک کوڑے کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگے ہوے ہیں، لیکن دوسری نظر میں پتا چلا کہ یہ زمین پر بیٹھے ہوے آدمیوں کی ٹولی ہے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" کسی دُکان دار نے مجھ سے پوچھا۔

"کوئی برادری معلوم ہوتی ہے،" میں نے کہا اور اُدھر بڑھنے کو تھا کہ ایک اَور دکان دار بولا:

"انھیں آپ نے بُلایا ہے؟"

"نہیں،" میں نے کہا۔

"ملنا تو آپ ہی سے چاہتے ہیں۔"

"مگر میں نے انھیں بُلایا نہیں ہے۔"

"اچھا اِن کی گاڑی تو ہٹوائیے۔ راستا رُک رہا ہے۔"

میں نے پکی سڑک پر کھڑی ہوئی گاڑی کو اب دیکھا۔ ایک بڑے سے پیپے کو بیچ سے کھڑا کھڑا کاٹ دیا گیا تھا۔ اس طرح اس کی شکل ایک مدوّر پیندے اور بغیر نوکوں والی چھوٹی ناؤ کی سی ہو گئی تھی، یا شاید وہ کوئی بےمصرف ناؤ ہی تھی، جس کے دونوں سِروں پر کسی پرانے درخت کے گول تنے کی بڑی بڑی ٹکیوں کے پہیے لگا کر اسے خشکی میں سفر کے قابل

بنایا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو زرا اَور غور سے دیکھا تو پتا چلا جسے میں پِیپا سمجھ رہا تھا وہ بھی کسی درخت کا آدھا کیا ہوا کھوکھلا تنا تھا جس کے نیچے ہری چھال کے ریشوں کی موٹی رسّی میں بندھا اور زمین کو قریب قریب چُھوتا ہوا ایک بڑا سا بےڈول پتّھر جُھول رہا تھا۔ یہ شاید گاڑی کا توازن قائم رکھنے کے لیے لٹکایا گیا تھا، پھر بھی گرد سے اَٹے ہوے دو آدمی اُسے دونوں طرف سے پکڑے ہوے تھے۔ میں نے بےدھیانی کے ساتھ سوچا، اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو گاڑی آگے کی طرف اُلٹے گی یا پیچھے کو۔ پھر میں نے اُسے اَور غور سے دیکھا۔

گاڑی کے خلا میں اوپر تک گودڑ بھرا ہوا تھا اور اس پر جھکی ہوئی ایک عورت گودڑ کو مسلسل اِدھر سے اُدھر کر رہی تھی۔ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ہونے کے باوجود وہ جوان معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک نظر اُس کو، اور گاڑی کو تھامے ہوے دونوں آدمیوں کو، دیکھا ہی تھا کہ ایک اَور دُکان دار کی آواز سنائی دی:

"کون سی برادری ہے؟"

میں نے مڑ کر کوزاگھر کے آگے زمین پر بیٹھے ہوے لوگوں کو دیکھا۔ دس بارہ آدمی تھے اور سب کے سب گرد میں اِس طرح اَٹے ہوے تھے کہ اُن کے لباسوں کے رنگ تک آسانی سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تاہم میں نے پہچان لیا کہ یہ اُجاڑ علاقوں کی رہنے والی کوئی برادری ہے۔ میں نے انھیں دیر تک دیکھا۔ وہ سب میری طرف بےتعلّقی سے دیکھ رہے تھے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں اِس برادری میں کبھی نہیں رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا نام پتا ان لوگوں کے پاس کہاں سے آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر کاغذ کے اُس پرزے کو غور سے دیکھا۔ تب اُن لوگوں نے بھی دیکھا کہ میرے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ ہے، اور اچانک سب میں جان سی پڑ گئی۔ انھوں نے جلدی جلدی آپس میں کچھ باتیں کیں، پھر سب کے سب اٹھ کھڑے ہوے۔ ان کے کپڑوں سے تھوڑی سی گرد اُڑی اور میں نے خود کو ان کے حلقے میں پایا۔ اسی کے ساتھ مَیں بازار والوں کے سوالوں کے بھی نرغے میں آ گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنا آخری سوال دُہرایا:

"کون سی برادری ہے؟"

میں نے بتا دیا کہ میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں، پھر بھی سب مجھ سے اِس طرح سوال کرتے رہے جیسے مجھ کو ان لوگوں کا ضامن سمجھ رہے ہوں۔ مگر اُن کے سوال ایسے تھے کہ میں ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا: یہ ناپاک لوگ تو نہیں ہیں؟ شہر میں چوری کی وارداتوں میں جو اچانک اضافہ ہو گیا ہے، کیا اس کا سبب یہی لوگ ہیں؟ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا یہ بھیک مانگنے والے ہیں؟

اب میں نے پوچھا:

"کیا انھوں نے کسی سے کچھ مانگا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں،" مجھے جواب ملا، "ہم تو جس وقت آئے ہیں یہ کاغذ دکھا دکھا کر سب سے آپ کا پتا پوچھ رہے تھے۔"

"کس بولی میں؟"

"اشارے سے۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا، "اشارے سے بھیک تو نہیں مانگ رہے تھے؟"

"مگر ان کا حلیہ تو دیکھیے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"اور گاڑی۔۔۔" سب سے بلند آواز والا دُکان دار بولا۔

"وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"۔۔۔اور گاڑی میں کس کو بِٹھا لائے ہیں؟ ابھی ختم ہو جائے تو ٹھکانے لگانے کے لیے ہمارے ہی سامنے نہیں روئیں گے؟ سب کھانے کمانے کے ڈھنگ ہیں۔"

اب میں نے گاڑی کے سوار کو دیکھا۔ ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ گاڑی میں بھرا ہوا گودڑ کچھ اوپر اُبھر آیا ہے، لیکن یہ اُس کے سوار کا بار بار جُھکتا ہوا سر تھا جسے عورت سہارا دیتی تھی لیکن وہ پھر جُھک جاتا تھا۔ میں بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ عورت نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اٹھانا شروع کیا تھا کہ مجھے ان سب لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں اور میں اُن کی طرف مُڑ گیا۔

وہ باربار میرے گھٹنے چُھو رہے تھے اور بول رہے تھے۔ اُن کی بولی میری

اپنی زبان کی کوئی بگڑی ہوئی -- یا بگڑنے سے پہلے کی، ابتدائی -- شکل معلوم ہوتی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آئی- وہ میرے گھٹنے چھوتے، پھر گاڑی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے لہجے میں لجاجت آ جاتی- اُس وقت مجھ کو بھی شبہ ہوتا تھا کہ یہ بھیک مانگنے والوں کی ٹولی ہے- ان سے دو ہی چار باتیں کرنے کے بعد مجھ کو احساس ہو گیا کہ وہ بھی میری زبان نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ میرا سپاٹ لہجہ ان کو اندازے سے بھی میری بات نہیں سمجھنے دیتا- خود ان کے لہجے مختلف تھے تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی بڑے خدشے میں مبتلا ہیں، طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں، مجھ سے کسی قسم کی امداد چاہتے ہیں، اور ان سب باتوں کا تعلّق گاڑی کے سوار سے ہے-

اِس عرصے میں عورت مستقل سوار کی نشست درست کرتی اور اس کے جھکتے ہوئے سر کو سہارا دیتی رہی تھی- میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا- سوار سینے تک گودڑ میں دفن تھا اور اس کے سر پر بھی گودڑ لپٹا ہوا تھا- عورت نے ایک طرف سرک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کیا اور میری طرف گھما دیا-

میرے سامنے ایک بچّے کا سُوجا ہوا چہرہ تھا- اس کی آنکھوں کے پپوٹے بہت پُھول گئے تھے- ایک پپوٹے میں ہلکی سی درز تھی جس میں سے وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا- دوسرا پپوٹا بالکل بند تھا لیکن اس پر چُونا یا کوئی اَور سفیدی پھیر کر بیچ میں کاجل یا کسی اَور سیاہی کا بڑا سا دیدہ بنا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اِس اُبھرے ہوئے پپوٹے پر ایسی آنکھ کا دھوکا ہوتا تھا جو حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہو- میں نے اس حیران آنکھ پر سے نظریں ہٹا لیں اور جھک کر دوسری آنکھ کی درز میں جھانکا- الجھی ہوئی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی نگاہ میں اذیّت بھی تھی، لجاجت بھی تھی اور بیزاری بھی- میں نے اس کے چہرے کو زرا اَور قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو گاڑی میں ٹھنسے ہوئے گودڑ میں لہریں سی پڑیں- سوار نے ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا- اُس کے ہونٹ سُکڑے اور دانت باہر نکل آئے- دور سے دُکان داروں کو وہ شاید ہنستا ہوا دکھائی دیا ہو لیکن مجھ کو وہ کسی بیمار کتّے کی طرح نظر آیا جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے ہوں-

مجھے اپنی پُشت پر بازار والوں کی بِھنبِھناہٹ اور برادری والوں کی تیز آوازیں سنائی دیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ آپس میں الجھ پڑے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں گروہ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن میری سمجھ میں کسی کی کوئی بات نہیں آئی۔ اُسی وقت عورت نے میرا ہاتھ دبوچ لیا اور میں اس کی طرف گھوم گیا۔ اُس نے اپنا دوسرا ہاتھ گودڑ میں ڈالا اور اِدھر اُدھر ٹٹول کر سوار کا ایک ہاتھ کہنی تک باہر نکال لیا۔ میرے سامنے تین ہاتھ تھے، میرا اپنا جانا پہچانا ہاتھ، اس کی انگلیوں میں انگلیاں الجھائے ہوئے عورت کا نرم، سفید اور دھیرے دھیرے پسیجتا ہوا ہاتھ، اور ہم دونوں کی ہتھیلیوں کے درمیان سوار کا چھوٹا سا سُوکھا ہوا ہاتھ جس کی کلائی سے کہنی تک رنگ برنگے ڈورے لپٹے ہوئے تھے اور ان کے بیچ بیچ سے دکھائی دیتی ہوئی مُردہ سی کھال میں جُھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔

عورت کی انگلیاں میری انگلیوں میں دل کی طرح دھڑکیں، مجھے ہلکی سی جُھرجُھری آئی اور سوار نے منھ سے ایک آواز نکالی، اُسی بیمار کتّے کی طرح جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے ہوں۔

ایک دُکان دار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں اُدھر مُڑ گیا۔

"گاڑی ہٹوائیے،" وہ کہہ رہا تھا، "دکان داری خراب ہو رہی ہے۔ سویرے سویرے یہ لوگ۔۔۔"

میں برادری والوں کی طرف مڑا۔ اب وہ سب خاموشی سے مجھ کو تک رہے تھے۔ میں نے انھیں سیدھی سڑک پر مغرب کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا جو ان کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ گاڑی کو سہارا دینے والے آدمیوں نے اسے آسانی سے مغرب کی طرف گھما دیا۔ عورت نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سوار کا ہاتھ گودڑ کے اندر کر کے اس کے سر کو سہارا دینا شروع کیا اور گاڑی ہلکی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے پیچھے اپنی میلی کچیلی پوٹلیاں سنبھالے اور ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھامے برادری والے چل رہے تھے اور سڑک کے دونوں طرف دُکان دار اور محلّے کے دوسرے لوگ، جن میں کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے، خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ میں گاڑی کے آگے آگے تیزی سے چلتا اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا پکی سڑک کے جنوبی موڑ تک پہنچ کر رکا۔ میں نے مڑ کر ان لوگوں کو اِس

موڑ پر آ کے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہے۔ اُن کے آس پاس دھویں کی طرح گرد منڈلا رہی تھی۔ اور اب مجھے سب کچھ ایک ساتھ نظر آیا۔ اُن میں سے ہر فرد اور ہر شے خستہ اور بوسیدہ اور عنقریب بکھر جانے والی معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی، میں نے سوچا، اگر سب کچھ اتنا غبارآلود نہ ہوتا، اور اگر گاڑی کے نیچے لٹکتا ہوا پتھر کچھ سڈول ہوتا تو اس جلوس پر کسی شاہی سواری کا بھی گمان ہو سکتا تھا۔

وہ میرے قریب آ کر رک گئے۔ میں نے ان کے پیچھے کچھ دور پر بازار والوں کو اپنی دُکانوں کی طرف جاتے اور تماشائیوں کی قطاروں کو منتشر ہوتے دیکھا، پھر میں برادری والوں کی طرف متوجہ ہوا اور انھوں نے شاید سمجھ لیا کہ اب میں اطمینان کے ساتھ ان کی بات سن سکتا ہوں۔ انھوں نے بھی اطمینان کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہ گاڑی کے سوار کے بارے میں مجھے تفصیلیں بتا رہے ہیں۔ لیکن ان تفصیلوں کا صرف ایک جُز میری سمجھ میں آ سکا کہ گاڑی کا وہ سوار آخری ہے۔ چھوٹی برادریوں میں گھومنے کے دوران میرے سامنے آخری کا مفہوم مختلف بولیوں میں اور مختلف اشاروں سے اتنی بار ادا کیا گیا تھا کہ اب اسے مَیں آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ اس برادری کا بھی قریب قریب ہر آدمی سوار کا حال بتانے کے بعد میرے گھٹنے چُھوتا اور بڑی لجاجت کے ساتھ جتاتا کہ وہ سوار آخری ہے۔

میں نے بلاسبب خود کو اُن کا، اور ان سے زیادہ اُس سوار کا، ضامن محسوس کیا اور انھیں مطمئن ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سب خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے، پھر سب نے ایک دوسرے کو مطمئن ہو جانے کا اشارہ کیا اور واقعی مطمئن ہو گئے۔ میں نے انھیں وہیں ٹھہر کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا، جیسے ابھی واپس آتا ہوں، اپنے مکان کے دروازے پر آ گیا۔

پاگل لڑکا دروازے پر کھڑا تھا اور ڈرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ کون لوگ ہیں؟" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پرچے والے ہیں،" میں نے جواب دیا، "تم نے انھیں انعام نہیں دیا؟"

"انعام؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔

میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

"جاؤ، دوڑ کر انعام لے آؤ، پھر ان کے پاس چلیں گے۔"

"نہیں،" اس نے کہا اور پہلے سے بھی زیادہ ڈرا ہوا معلوم ہونے لگا۔

"اچھا جاؤ، کھیلو،" میں نے کہا، "مجھے کام ہے۔"

"وہ بڈھا کون ہے؟"

"بڈھا؟"

"جو گاڑی میں چھپا ہوا ہے۔"

"وہ بڈھا نہیں ہے،" میں نے کہا۔

پھر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے اُسے بچہ کیوں سمجھ لیا تھا؟ وہ کوئی بوڑھا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اُس کی ہیئت یاد کی۔ اس کا چہرہ سُوجا ہوا تھا اور ہاتھوں پر جُھرّیاں تھیں۔ میں نے ذہن پر زور ڈال کر اُس کے ہاتھ کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی جگہ مجھے عورت کا سفید، پسیجا ہوا ہاتھ یاد آیا جس کی انگلیاں میری انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں اور دل کی طرح دھڑکتی تھیں۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور برادری والوں کی باتوں اور اشاروں کو یاد کرنے لگا۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا تھا کہ وہ آخری ہے۔ برادری کا آخری بچہ، یا آخری بوڑھا؟ کسی آدمی کی، یا کسی واقعے کی، آخری نشانی؟ کسی چیز کی، یا کسی زمانے کی، آخری یادگار؟ میرا دماغ الجھتا گیا۔ اور میں نے اس الجھن میں شاید بہت وقت گزار دیا، اس لیے کہ جب میں نے فیصلہ کیا کہ اُسے پھر سے جا کر دیکھوں تو پاگل لڑکا جا چکا تھا اور دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی۔

کوڑاگھر اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا مَیں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا وہ سب میری طرف آ رہے ہیں۔ گاڑی آگے آگے تھی۔ سوار کا چہرہ گاڑی کی ککار پر ٹِکا ہوا تھا اور اُس کے سر پر لپٹا ہوا گودڑ اب جگہ جگہ سے کھل گیا تھا۔ عورت باربار خود بھی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور ہر بار کوئی نہ کوئی اُسے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیتا تھا۔ مجھے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کے پیچھے ان کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کچھ گا رہے تھے۔ باری باری ایک آدمی کچھ بول کہتا اور اس کے آخری لفظوں کو سب مل کر دُہراتے تھے۔ انھوں نے ایک صف بنا لی تھی اور ان کی آوازیں بلند

ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک آدمی صف سے زرا آگے نکلا، اس نے لحن سے کچھ کہا اور سب نے اسے دُہرایا۔ وہ آدمی صف میں واپس چلا گیا اور دوسرا آدمی آگے نکلا۔ اُس کی آواز اور دوسروں کی جوابی آواز پہلے کی آوازوں سے زیادہ بلند تھی۔ اور اب ان کے ہاتھ اور بدن کچھ رقص کے سے انداز میں جنبش کر رہے تھے۔ کچھ کچھ دیر بعد کوئی ایک آدمی آگے بڑھتا، کچھ بول کہتا، سب اس کا ساتھ دیتے، پھر چپ ہو کر یوں سر ہلاتے جیسے اسے داد دے رہے ہوں۔ میرے خیال میں وہ داد دینے کا اشارہ تھا، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس برادری میں اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

میں اُن کی آنکھوں کے ٹھیک سامنے ہونے کے باوجود انھیں شاید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی پیش قدمی کے ساتھ مَیں الٹےقدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میرے کان اُن کی آوازوں پر اور نگاہیں ان کی جنبشوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کوئی داستان سنا رہے تھے اور اس داستان کے مبہم منظر میرے سامنے خواب کے خاکوں کی طرح بَن بَن کر مِٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچے کو گودیوں میں کِھلایا جا رہا ہے۔ بچہ چلنا سیکھ رہا ہے۔ ڈگمگاتا ہوا چلتا ہے، چلتے چلتے گر کر رو رہا ہے، اٹھایا جاتا ہے، بہلایا جاتا ہے، بہل گیا ہے۔ دوڑ رہا ہے۔ درخت پر چڑھ رہا ہے۔ تھک کر سو گیا ہے۔ سو کر اٹھا ہے۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں مَل رہا ہے اور اس کی دونوں آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔

مجھے بہت سی سرخ آنکھوں کے جوڑے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ اب وہ سب ایک ساتھ، ایک ہی لحن میں، ایک ہی اشارے سے آخری آخری کہہ رہے تھے اور اُن کے گلے پھٹے جا رہے تھے۔ ان پر ایک جوش طاری تھا اور معلوم ہوتا تھا سب غصّے سے پاگل ہو رہے ہیں۔ پھر سب پر نشہ سا چڑھ گیا۔ ہلکی گرد نے ان کے کپڑوں سے نکل نکل کر اور ان کے قدموں سے اُٹھ اُٹھ کر ان کو لپیٹ لیا۔ اس گرد کے پیچھے گاڑی کے سوار کے چہرے کو عورت نے پھر سہارا دے کر اوپر اٹھا دیا تھا۔ اس کی آنکھ کی درز بند ہو گئی تھی۔ لیکن دوسری، سفیدی اور سیاہی سے بنی ہوئی، آنکھ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی اور گرد میں اَٹ جانے کے بعد بھی بند نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی سڑک کے کسی کھانچے پر سے گزری۔ سوار کے سر کو ایک جھٹکا لگا۔

آنکھ میں ملامت جھلکی، پھر غصہ، پھر ہلکا سا نشہ، اور وہ پھر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

دُکانوں کے سلسلے کے قریب پہنچتے ہی وہ سب خاموش ہو کر رک گئے۔ سب تھکن سے چُور اور میری موجودگی سے بےخبر معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور دور پر میرے مکان کے دروازے کی طرف اشارے کرنے لگے۔ میں مُڑا اور تیزی سے اپنے مکان کی طرف چلا۔ دروازہ آنے سے کچھ پہلے مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ اَب وہ میری طرف اشارے کر کر کے ایک دوسرے کو کچھ بتا رہے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھنے لگے، سیدھے میری طرف۔ میں مڑا اور اپنے دروازے کو پیچھے چھوڑتا ہوا کوئی چالیس قدم آگے نکل کر پھر رکا۔ آہستہ سے گھوم کر میں نے اُن کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کوڑے کے متحرک ڈھیر کی طرح نظر آئے۔ پھر اُن کی ترتیب بگڑ گئی اور سب نے سر جھکا لیے۔

دیر تک مجھ پر یہ احساس غالب رہا کہ میں نے کوئی منظر دیکھا ہے جسے آئندہ کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے ہلکا سا پچھتاوا بھی تھا کہ میں خود اس منظر میں شامل نہیں ہوا۔

تاہم میں نے خود کو بہت محفوظ بھی محسوس کیا اس لیے کہ اب وہ لوگ شمال کی سمت کٹنے والی اُس بےنام کچی سڑک پر اُتر رہے تھے جو شہر سے باہر اُجاڑ علاقوں کی طرف جاتی تھی۔

فہمیدہ ریاض

یہ جو تنہائی

یہ جو تنہائی ہے شاید مری تنہائی نہ ہو

گونجتا ہو نہ سماعت میں سکوت
اور شب و روز کی لاش
میری دہلیز پہ ایّام نے دفنائی نہ ہو

اَن گِنت پھول کہیں کِھلتے ہوں
اک شجر مولسری کا ہو کہیں جس کے تلے
یار اغیار گلے مِلتے ہوں
آن پہنچے ہوں خوشی کے موسم
راہ تکتے ہوں مری
اور مجھ تک کسی باعث یہ خبر آئی نہ ہو

ہو کے خوش ہنستے ہوں احباب تمام
بھیجتے ہوں مجھے کب سے پیغام
ڈھونڈتے ہوں مجھے بےتابانہ
راہ تکتے ہوں مری
اور مجھ تک کسی باعث یہ خبر آئی نہ ہو

اک سحر مَیں

اک سحر مَیں یہ کنارا چھوڑ دوں گی

مجھ سے کہتا ہے بہاؤ
ختم ہو گا یہ تناؤ
کھینچتی رہتی ہوں ڈورے بادباں کے
رات دن
ان کو اک دن توڑ دوں گی
دھار پر پانی کی ناؤ چھوڑ دوں گی

تار میں پانی بہے گا اور ہو گا
آسماں پر صبح کا مدّھم ستارا
ایک دن مَیں چھوڑ دوں گی یہ کنارا

گِریاں ہیں عشّاق

گِریاں ہیں عشّاق، بےصبرانہ
آج سحر سے
زیر و زبر ہے بحر و بیاباں مدّوجزر سے
اے باد کہنا بیدادگر سے
طولِ الم کا اعلان تیرا
تو نے کہا پر دل تو نہ مانا

دل ووں ہی مشتاق
گِریاں ہیں عشّاق

پھرتے ہیں ہر سمت دیدۂ پُرخوں
پربت پہ شہباز
صحرا میں مجنوں
اَب عزم کیا ہے، اے جذبِ سفّاک
کیوں نوچتا ہے چھاتی کے پھر چاک
پھر طائرِ شوق مائل بہ پرواز
ماقبلِ آغاز
چُکتا ہے کف سے مرغوب دانہ
بےصبرانہ
گِریاں ہیں عشّاق

مجسّمہ

مجسّمہ گِرا دیا
مگر یہ داستاں ابھی تمام تو نہیں ہوئی

کئی ورق سفید ہیں
لکھے گا جن پہ آدمی
اک اَور بابِ جستجو
کہ حسن کی تلاش میں
کہ منصفی کی آس میں
پھِری ہے خلق کوُ بہ کوُ

ُدکاں میں کتنا مال ہے
ُدکاں میں حسن تو نہیں
ُدکاں میں منصفی نہیں

ابھی پہر ڈھلا نہیں
ابھی رواں ہے کارواں
دلوں میں نصب ہیں نشاں
مجسّمہ گرا مگر
زمیں پہ زندگی ُدکاں کے نام تو نہیں ہوئی
ہماری داستاں ابھی تمام تو نہیں ہوئی

اک مچھوے کا جال

نیلی جھاگ بھری لہروں میں
ہولے ہولے ڈوب رہا ہے دل کا برنجی تھال

اک مورت کو توڑ رہے ہیں جوش میں بپھرے لوگ
ساحل پر اڑتے پھرتے ہیں کچھ پتّے پامال
کئی بھکاری راہ میں بیٹھے پھیلائے کشکول
کئی ُدکانوں میں رکّھا ہے بہت بدیسی مال

اک ننگا بےہنگم لڑکا
جھوٹا دونا چاٹ چکا ہے
لہروں پر پتّھر برساتا
اب اُکتا کر کھیل رہا ہے

پانی میں مِٹتی بنتی ہے مورت کی تصویر
لہر لہر میں ٹوٹ رہے ہیں جیسے کئی سوال
تیز ہوا میں دیکھو کیا ہے
جھاگ بھری لہروں کے اوپر
ناگ کے پھن سا لہراتا ہے
اک مچھوے کا جال

افضال احمد سیّد

ہمارا قومی درخت

سفید یاسمین کے بجائے
ہم کیکر کو اپنی شناخت قرار دیتے ہیں
جو امریکی یونیورسٹیوں کے کیمپس پر نہیں اُگتا
کسی بھی ٹروپیکل گارڈن میں نہیں لگایا جاتا
اِکےبانا خواتین نے اسے کبھی نہیں چھُوا
نباتات کے ماہر اسے درخت نہیں مانتے
کیوں‌کہ اس پر کسی کو پھانسی نہیں دی جا سکتی

کیکر ایک جھاڑی ہے
جس سے ہماری شہر، ریگستان
اور شاعری بھری ہے

کانٹوں سے بھرا ہوا کیکر
ہمیں پسند ہے
جس نے ہماری مٹّی کو بحیرۂ عرب میں جانے سے روکا

دریائے سندھ ہمارے دُکھ کیوں نہیں بہا لے جاتا

اُس تمام خون سے
جو بہا
چارلس نیپیر
اپنی نگاہ میں بری الذمہ تھا
جیسا کہ ڈیڑھ سو سال بعد تک
اُس کے جانشین ثابت ہوئے

اس کے علاوہ بھی
سب کچھ اُسی طرح تھا

صرف
جسمانی ریمانڈ میں آئی ہوئی خواتین پر
خراب پِسی ہوئی مرچ کے بجائے
حساس اداروں میں
"ٹوباسکو ساس" کا استعمال کیا گیا

اور
کارکردگی بہتر ہو جانے کی وجہ سے
لوگوں کو چند منٹوں میں
ایک خوب صورت میز تک پہنچانا ممکن ہوا
جس پر
ان کی طبعی موت کے
دستخط کیے ہوئے سرٹیفکیٹ جمع تھے

وہ آدمی جسے لڑکیوں کی جِلد پسند تھی

وہ آدمی جسے لڑکیوں کی جِلد پسند تھی
اپنی پورنوگرافی کی کتابوں پر منڈھنے کے لیے

اس نے فوج کے ایک بھگوڑے کو
ایک محکوم لڑکی کی زندہ کھِنچی ہوئی کھال
حاصل کرنے کی ترغیب دی

مذکورہ بھگوڑا
سندھ سے دو بار گزرا

ہمیں پورنوگرافی کی کتابوں کو
احتیاط سے چُھونا چاہیے

ایک زنگ آلود پِن

ڈاکٹر پیدرو آرا

کسی لاش کو حنوط کرنے کا کام
ملنے کا انتظار کرتے کرتے
ہمارے ملک میں
فاقہ کشی سے مر جاتا

ہمارے کسی صدر کو
اپنی مستقل شریک کے

اذیّت کی موت مر جانے کے بعد
اُسے گوشت پوست میں محفوظ کرنے کا خیال نہیں آیا

مگر سارے صدر ایک جیسے نہیں ہوتے
اور نہ ساری خواتینِ اوّل پریما بیلےرِینا
جس کو مٹّی میں مل جانا
زیب نہیں دیتا
اگر وہ ڈاکٹر پیدرو آرا کی ہم وطن
اور ایک ملک کے سربراہ کی ہم بستر
کی حیثیت میں دم توڑے

صدر کی خواب گاہ میں
وہ اپنے کھلے تابوت کے اندر
تین سال تک پُرسکون پڑی رہی

معزولی کے بعد
سابق حکمراں نے اسے اپنی جلاوطنی میں شریک رکھا
اور وہ میڈرِڈ کے ایک تہہ خانے تک پہنچنے کے لیے
سارا اٹلانٹِک پار کر گئی

تیس سال بعد
اقتدار پر دوبارہ قابض ہونے کے لیے
جلاوطن صدر نے
دوبارہ اٹلانٹک عبور کیا
پریما بیلےرِینا کے تابوت کے بغیر

صرف اِس لیے
کہ ان کی محبوبہ

مشہور فلمی اداکارہ کو
بدصورت چیزوں سے نفرت تھی
جیسے
کسی حنوط کی ہوئی لاش کے بالوں میں لگا
ایک زنگ آلود پن

کتّے کی موت

ایر وائس مارشل منوچہر نادرشا
ایک شہری پرواز پر
رات کے کھانے کے دوران
گلے میں ہڈّی پھنس جانے کی وجہ سے
مر جاتے ہیں

ایسی ہی ایک اور ہڈّی کے آگے
دوسرا کتّا ڈال دو

ایک دشوار سوال

سیزر کے قتل کے وقت
قلوپطرہ کہاں تھی

صحیح جواب پر
روم کا سفر
مفت

اسٹریلا ڈی کیوروز کی موت

انکلساریا اسپتال کی چوتھی منزل پر
اسٹریلا ڈی کیوروز
دس ہزار سے زیادہ کا حساب چھوڑ کر
مر گئی

اور لیڈی آف فطیما میں آخری رسومات
اور ایلائیڈ بینک میں
اوورڈرافٹ کی تیاریاں ہونے لگیں

چند دنوں پہلے
ایک علانیہ بوسہ اور ایک مشکوک چیک پیش کرنے پر
یہ دونوں ادارے
بالترتیب
اُسے ناپسندیدہ قرار دے چکے تھے

پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ
ہر چیز طے کر لی گئی
سیاہ تابوت کے اطراف
اور لیڈی آف فطیما کی نشستیں بھر گئیں

بھدّے طور پر ریکارڈ کی ہوئی ماتمی دُعائیں بجنے لگیں
اسٹریلا ڈی کیوروز کے لیے
جو بہت اچھا گاتی تھی

ایمپریس مارکیٹ سے واپسی

اطاعت گزار پوروچِستا دستور کو
ہر تعطیل کے دن
مکروہ ایمپریس مارکیٹ کے
بیف سیکشن آنا پڑتا ہے

اپنے جیسی بلاؤز اور غیرپُرکشش اسکرٹ میں
پوروچستا دستور
ٹیٹراپوڈِک اور دوسری محبّتوں سے
محفوظ سمجھی جا سکتی ہے
یہ یقین کیا جا سکتا ہے
وہ مشتبہ ہوٹلوں، اسٹیٹ ایجنسیوں
اور گیلے خوابوں میں نہیں آ سکتی
اور صرف ایک مرد کی موجودگی میں
لفٹ پر نہیں چڑھتی

ایک کلو گوشت سمیت
پوروچستا دستور
نیم ویران سمرسیٹ اسٹریٹ تک پہنچ کر
بس میں سوار ہونے سے پہلے

شکستہ ہوتی ہوئی دیورات بلڈنگ کی
پہلی منزل پر جاتی ہے
اور کھڑے ہو کر پیشاب کرتی ہے
جیسا کہ ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق
مصر کی لڑکیاں کیا کرتی تھیں

ایک ناممکن لڑکی

پَریکت اگروال
سلاٹرہاؤس کی اسمبلی لائن سے گزر کر
بینک کے کاؤنٹر پر متعیّن ہوئی
اُس کی کشتی جیسی آنکھیں
خوشی سے
اور موسیقارانہ حلق کھر سے بھر گیا

ہائی اسٹریٹ پر وہ
بغیر سورج مکھی کے بیج کھاتے ہوئے گزری

پَریکت اگروال
اپنی ڈیزائنر بریزیئر کا اسٹریپ درست کرتی ہے
ایک اکزاٹِک مسکراہٹ دیتی ہے
اور اپنے پیر ہلاتی ہے
جن میں کوئی زنجیر نہیں ہے

پَریکت اگروال

اپنے کام میں مستعد ہے

بابیلون میں وہ
افرودیتی کے نام پر طلب کی جا سکتی تھی
اور کارتھیج میں
گھنٹیاں بجا بجا کر
گزرنے والوں کو حمّام میں آنے کی دعوت دے سکتی تھی

بینک قائم کرنے والے سودخور
اور اُن کی حرامی اولادیں
پَریکت اگروال سے ذلیل ہوئے بغیر مر جاتے
اگر وہ ایک شام
اپنا بہترین پاؤں آگے رکھتے ہوئے
باریک ٹرکوائز لانژیری میں
کیٹ واک پر نہ آتی

میروسلاو ہولب (Miroslav Holub)

ہولب کی شخصیت کو شاعر اور سائنس داں کا ایک دل چسپ آمیزہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک جانب وہ چیک زبان کے نمایاں ترین شاعروں میں سے ایک ہیں اور دوسری طرف اپنے ملک کے ایک نامور کلینیکل پیتھولوجِسٹ بھی ہیں۔ انھوں نے ریسرچ اور سائنسی کانگریسوں میں شرکت کے لیے دنیابھر میں سفر کیا ہے۔ ہولب کی مطبوعات میں شاعری کے مجموعے بھی ہیں، سفرنامے بھی اور سائنسی موضوعات پر علمی مقالے بھی۔ پینگوئن کے شائع کردہ ہولب کی نظموں کے انتخاب کا تعارف کراتے ہوے اے الواریز نے نہ صرف ان کی نظموں میں غیرجذباتی اندازِفکر اور زبان کے مرتکز استعمال کو بلکہ تجربات سے ہولب کے شغف کو بھی ان کی سائنسی تربیت کی عطا قرار دیا ہے۔

ہولب ۱۹۲۳ میں پلسن (Plzen) شہر کے ایک ریلوے کارکن اور زبان کے استاد کے گھر پیدا ہوے۔ انھوں نے تقریباً تیس برس کی عمر میں اپنی کلینیکل ریسرچ اور شاعری کا بیک وقت آغاز کیا۔ اس طرح تجربی سائنس اور تجربی شاعری ان کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ خود ہولب کا کہنا ہے: "سائنسی ذہن اور فنکارانہ ذہن کے درمیان کوئی گہرا فرق نہیں پایا جاتا؛ دونوں میں انتہائی خلّاقیت اور انتہائی آزادی ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ سائنس نظری بھی ہوتی ہے اور تجربی بھی۔ آرٹ صرف تجربی ہوتا ہے۔" الواریز کے خیال میں اس سے ہولب کی مراد فقط ہیئت کے تجربے نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہولب کی نظموں کی ساخت بےحد غیرروایتی ہے اور انھوں نے خالص ادبی حدود کو توڑنے کی دانستہ کوششیں بھی کی ہیں لیکن اس اعتبار سے وہ چیک شاعری کی اُس روایت مخالف روایت کا تسلسل ہیں جو ان سے پہلے بھی موجود رہی ہے۔ ہولب کی تجربہ پسندی نے اس سے آگے جا کر ایسے موضوعات اور تکنیکوں کو بھی شاعری میں استعمال کیا جنھیں نہ صرف غیرادبی بلکہ ادب مخالف خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی لچک دار ہیئت کی تشکیل ہوئی ہے جو کسی بھی قسم کے انسانی تجربے یا احساس کو سمیٹ سکتی ہے۔

ہولب سیاسی لحاظ سے مارکسسٹ رہے ہیں، لیکن ان کے سیاسی خیالات نے کبھی ایقان (dogma) یا پارٹی کی اندھادھند حمایت کی صورت اختیار نہیں کی۔ ان کی نظموں کا خاصا بڑا حصّہ اسٹیبلِشمنٹ اور بیوروکریسی کے ہتھکنڈوں کے خلاف فنکارانہ ردِّعمل پر مشتمل ہے۔ ہولب کو مارکسزم، انسانیت نوازی اور امیدپرستی جیسے خانوں میں قید کرنا مشکل ہے۔ ان کی شاعری کی جڑیں اس سے زیادہ ٹھوس اور تجرباتی زمین میں ہیں؛ لوگوں کی زندگیوں اور ان کے رنج و محن کے ایک مزاحمانہ، شائستہ اور پُرتشکیک احساس میں۔ ہولب اگر امیدپرست نظر آتے ہیں تو یہ اس سائنسدان کی سی عملی، غیرنظری امیدپرستی ہے جو کسی نئی دریافت کی موہوم امید میں تجربے کی اکتا دینے والی طوالت برداشت کرتا جا رہا ہو۔ ہولب کے الفاظ میں: "مختلف حقیقتیں وجود نہیں رکھتیں۔ آرٹ کوئی نئی حقیقت خلق نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق تک ایک تازہ اور عمیق تر رسائی ایجاد کرتا ہے۔ یہ حقائق صرف اُس لمحے تک فنون اور فلسفے کی سلطنت ہیں جب تک سائنسی طریقِ کار کی دست رس میں نہیں آ جاتے۔" الواریز کے خیال میں ہولب کی تمام تر تکنیک حقیقت کی دریافت اور تجزیے پر مرتکز ہے۔

ہولب کا نظریۂ شعر ان کے اس اقتباس سے مرتب کیا جا سکتا ہے: "آرٹ کو ایک مکمل شخصیت کا اظہار ہونا چاہیے جو ان تمام معلومات اور مفروضات سے باخبر ہو جو جدید دنیا کے شہری کی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ فنون کی دنیا سے سائنس کا توہم پرستانہ اخراج دراصل تخلیقیت کی حفاظت نہیں کرتا؛ یہ صرف پرانے رویّوں اور ازکاررفتہ ردِّعمل کی حفاظت کرتا ہے جو جدید دنیا میں روزبروز راہ گم کردہ ہوتے جاتے ہیں۔" ہولب کو ماضی پرستی سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس کے برخلاف ان کی قوت کا منبع موجودہ حقائق کو دھیمے اور ناقدانہ انداز میں قبول کرنا رہا ہے۔ مجموعی طور پر ہولب کی شاعری کی بنیاد جدید دنیا کے جذباتیت سے عاری اور تجسّس، ہم دردی اور مزاح سے پُر احساس پر ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں:

شاعری ہر شے میں موجود ہے
یہی شاعری کے خلاف سب سے بڑی دلیل ہے

میروسلاو ہولب

انگریزی سے ترجمہ: زاہد ڈار، افضال احمد سیّد، اجمل کمال

مُردہ زبان کی نصابی کتاب

یہ ایک لڑکا ہے
یہ ایک لڑکی ہے
لڑکے کے پاس ایک کتا ہے
لڑکی کے پاس ایک بلّی ہے
کتے کا کیا رنگ ہے؟
بلّی کا کیا رنگ ہے؟
لڑکا اور لڑکی ایک گیند کے ساتھ کھیل رہے ہیں
گیند کہاں لڑھکتی جا رہی ہے؟
لڑکا کہاں دفن ہے؟
لڑکی کہاں دفن ہے؟
پڑھو
اور ترجمہ کرو
ہر ایک خاموشی اور ہر ایک زبان میں
لکھو
کہ تم خود کہاں دفن ہو!

(ز۔ ڈ۔)

مدد کا ہاتھ

ہم نے گھاس کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا
اور وہ مکئی میں بدل گئی

ہم نے آگ کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا
اور وہ راکٹ میں تبدیل ہو گئی

جھجھکتے ہوے
احتیاط کے ساتھ
ہم مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں
لوگوں کی طرف۔۔۔
کچھ لوگوں کی طرف۔۔۔

(ا۔ ڈ۔)

نپولین

بچّو، نپولین بوناپارٹ کب پیدا ہوا تھا؟
ٹیچر پوچھتی ہے

ایک ہزار سال پہلے، بچّے کہتے ہیں
ایک سو سال پہلے، بچّے کہتے ہیں
پچھلے سال، بچّے کہتے ہیں
کوئی نہیں جانتا

بچّو، نپولین بوناپارٹ نے کیا کِیا؟
ٹیچر پوچھتی ہے

ایک جنگ جیتی، بچّے کہتے ہیں
ایک جنگ ہار گیا، بچّے کہتے ہیں
کوئی نہیں جانتا

ہمارے قسائی کے پاس ایک کتا تھا
جس کو نپولین پکارتے تھے
-- فرانٹیزِک نے کہا --
قسائی اس کو پِیٹا کرتا تھا
اور وہ کتا، ایک سال ہوا،
بھوک سے مر گیا

اب تمام بچّے نپولین کے لیے اداس ہیں

(ا- ا- س-)

سبق

ایک درخت داخل ہوتا ہے اور جھک کر کہتا ہے:
میں ایک درخت ہوں
ایک سیاہ آنسو آسمان سے گرتا ہے اور کہتا ہے:
میں ایک پرندہ ہوں
مکڑی کے جالے میں سے
محبّت جیسی کوئی چیز نکل کر قریب آتی ہے اور کہتی ہے:
میں خاموشی ہوں

لیکن بلیک بورڈ کے قریب ایک گھوڑا
اپنی جانی پہچانی واسکٹ میں قلابازیاں کھاتا ہے
اور اپنے کان دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے باربار دوہراتا ہے:
میں تاریخ کا انجن ہوں
اور ہم سب
ترقی
اور جرأت
اور سورماؤں کے غضب سے محبّت کرتے ہیں

کلاس روم کے دروازے کے نیچے
خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ رہی ہے

کیوں‌کہ یہاں سے معصوموں کا قتل شروع ہوتا ہے

(ا۔ ک۔)

ایک لڑکے کا سر

اس میں ایک خلائی جہاز
اور پیانو کے سبق یاد کرنے کا ایک منصوبہ ہے

اس میں نوح کی کشتی ہے
جو پہلی کشتی ہو گی

اس میں ایک بالکل نیا پرندہ ہے
ایک بالکل نیا خرگوش

ایک بالکل نئی شہد کی مکھی

اس میں ایک دریا ہے
جو اوپر کو بہتا ہے
اس میں ایک پہاڑا ہے
اس میں اینٹی مَیٹر ہے

اور اسے قلم نہیں کیا جا سکتا
میں صرف اسی کو سر مانتا ہوں
جسے قلم نہ کیا جا سکے

اس بات میں بہت بڑی امید ہے
کہ اتنے سارے لوگوں کے پاس
سر ہیں

(ا۔ ک۔)

قوّتِ پرواز

ہمارے پاس
خوردبین سے دیکھی جانے والی مخلوق کے بیان کے لیے
کائنات کا ایک نقشہ ہے
ہمارے پاس کائنات کے بیان کے لیے
جرثومے کا ایک خاکہ ہے

ہمارے پاس
الیکٹرونک سرکِٹس کا بنا ہوا

شطرنج کا ایک گرینڈ ماسٹر ہے

لیکن سب سے بڑھ کر
ہمارے پاس صلاحیت ہے
مونگ پھلیاں چھیلنے کی
چلّو میں پانی بھرنے کی
سوفے کے نیچے ایک پیچ کی تلاش میں
گھنٹوں جُٹے رہنے کی

قوّتِ پرواز
ہمیں اِسی سے ملتی ہے

(ا۔٢

ساحل

سمندر ناپ لیا گیا
　　اور زمین سے جکڑ دیا گیا
زمین ناپ لی گئی
　　اور سمندر سے جکڑ دی گئی

انھوں نے منجنیقیں اور جہاز بنائے
انھوں نے ہجرزدہ جل پریوں کی آہیں گِنیں
انھوں نے لنگروں کی بےتاب ہل چل کا اندازہ کیا
انھوں نے دنیا کے گرد سفر کے پیچیدہ راستے بنائے

انھوں نے پانچ براعظم دریافت کیے

زمین ناپ لی گئی اور سمندر سے جکڑ دی گئی
سمندر ناپ لیا گیا اور زمین سے جکڑ دیا گیا

جو کچھ باقی رہ گیا
وہ نہر کے پاس بلندی پر واقع ایک مکان ہے
ایک آدمی جو نرمی سے بات کرتا ہے
ایک عورت جس کی آنکھیں نَم ہیں
جو کچھ باقی رہ گیا وہ شام کا چراغ ہے
میز کا براعظم
اور میزپوش؛ اُڑ کر نہ جانے والا ایک بگلا

جو کچھ باقی رہ گیا
وہ چائے کا ایک کپ ہے
دنیا کا سب سے گہرا سمندر

(ا۔ ک۔)

کہانی

اس نے اپنے لیے ایک مکان بنایا
اپنی نِیو
اپنے پتھر
اپنی دیواریں
اپنی چھت
اپنی چمنی اور دھواں
اپنی کھڑکی کا نظارہ

اس نے اپنے لیے ایک باغ بنایا
اپنا جنگلا
اپنا سبزہ
اپنا کیچوا
اپنی اوس

اس نے آسمان میں سے اپنے لیے ایک ٹکڑا کاٹ لیا

اس نے اپنے مکان کو اپنے باغ میں لپیٹا
باغ کو اپنے آسمان میں
اور یہ سب کچھ اپنے رومال میں

اور پھر ایک آرکٹِک لومڑی کی طرح
سرد اور مسلسل بارش میں
وہ دنیا میں نکل گیا

(ا۔ ک۔)

محبّت

دو ہزار سگریٹ
دیوار سے دیوار تک
ایک سو میل کا فاصلہ
بےخوابی کی ڈیڑھ ابدیتیں
برف سے زیادہ خالی

ریت میں کسی پلیٹی پَس کے چلنے سے بنے ہوے راستوں کی طرح
کئی ٹن پرانے الفاظ

ایک سو کتابیں جو ہم نے نہیں لکھیں
ایک سو اہرام جو ہم نے نہیں بنائے

کوڑاکرکٹ
ریت
دنیا کی ابتدا کی طرح
تلخ

مجھ پر یقین کرو
جب میں کہوں:
یہ سب بہت خوب صورت تھا

(ا۔ ک۔)

حقیقت

اذیّت کے حقیر کیڑے
جو ابھی تک شفاف ہوا میں کلبلا رہے تھے
آخر ساکت ہو گئے
اور ہمارے اندر کسی چیز نے
آپریشن ٹیبل، کھڑکی،
خلا
اور سات تلواروں کے فولاد کی حقیقت کے سامنے
سر جھکا دیا

خاموشی
آئینے کی سطح کی طرح مستحکم تھی
اگرچہ ہم پوچھنا چاہتے تھے کہ
خون کہاں بہہ رہا ہے؟
اور تم؟
کیا تم مر چکی ہو؟

(ا- ک-)

شام میں موت

اوپر اس کے آخری الفاظ
بادلوں کی طرح
چھت پر سے گزر رہے تھے
الماری رو رہی تھی
ایپرن یوں کپکپا رہا تھا
جیسے کسی خلا کو ڈھانپے ہوئے ہو

خاتمہ۔۔۔
جس کے بعد بچّے جا کر سو گئے

لیکن آدھی رات کو مردہ عورت اٹھی
اس نے موم بتیاں بجھائیں
(اسے ان کے ضائع ہونے پر افسوس ہوتا ہے)
آخری موزا رفو کیا
ایک خالی ڈبے میں پچاس کا سکّہ پایا
اور اسے میز پر رکھ دیا

الماری کے پیچھے گری ہوئی قینچی ڈھونڈ کر نکالی
ایک دستانہ تلاش کیا
جو ان سے سال بھر پہلے کھو گیا تھا
سارے دروازوں کی بند چٹخنیاں ہلا کر دیکھیں
نل بند کیا
کافی ختم کی
اور جا کر پھر لیٹ گئی

صبح لوگ اسے لے گئے
اسے جلا دیا گیا
اس کی راکھ کوئلے کی طرح سخت تھی

ہوائی حملے کے پانچ منٹ بعد

پِلسَن شہر
۲٦ ، اسٹیشن روڈ

وہ اس زینے سے تیسری منزل پر چڑھی
جو پورے مکان میں
بچ جانے والی واحد شے تھا
اس نے اپنا دروازہ کھولا
جو آسمان پر کھلا
اس نے دہلیز پر کھڑے ہو کر ایک جمائی لی

کیوں‌کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں دنیا ختم ہو جاتی تھی

اس نے احتیاط کے ساتھ باورچی خانہ بند کیا
اور نیچے جا کر انتظار کرنے لگی
کہ مکان پھر سے کھڑا ہو جائے
اور اس کا شوہر قبر سے اٹھ کھڑا ہو
اور اس کے بچوں کے ہاتھ پیر
دوبارہ اپنی جگھوں پر جا لگیں

صبح جب انھوں نے اسے اٹھایا
وہ پتھر کی طرح ساکن تھی
چڑیا اپنی چونچ سے
اس کی ہتھیلی کرید رہی تھی

(ا- ک-)

انتظار

انتظار کرنے والی ہمیشہ ماں ہوتی ہے
اس کی انگلیاں
دنیا کے خودکار دروازوں میں پھنس جاتی ہیں
اس کے تھیلے میں
گزرے وقتوں کا آئینہ ہے
جب مسرور آوازیں سیب کے درخت میں رہتی تھیں
اور گھر پر سوئی اور دھاگا آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے:
ہمارا کیا ہو گا؟

انتظار کرنے والی ہمیشہ ماں ہوتی ہے

اور ایک ہزار دوسری چیزیں
زوال جن کی تقدیر ہے

انتظار کرنے والی ہمیشہ ماں ہوتی ہے
لمحہ لمحہ گھُلتی ہوئی
معدوم ہوتی ہوئی
یہاں تک کہ وہ ہر ایک کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے
(ا۔ ک۔)

ہم جنھوں نے قہقہہ لگایا

ہم نکال دیے گئے
کلاس روم سے، چوک سے،
جوئے خانے، اسٹاک ایکسچینج اور بازار سے،
ٹیلی وژن اسکرین اور گِلٹ فریم سے
اور تمام تاریخ سے
ہم
جنھوں نے قہقہہ لگایا

شہر اپنی اہمیت میں
دو منزل بلند ہو گیا
اور ٹیلی فون ٹیپ کرنے والے آلوں نے
خاموشی میں
بہتر ٹیپ کیا
اور چوکی دار نے
بہتر نگرانی کی

اور محبّت ایک خنجر کے لیے لپکی
اور خنجر خون کے لیے لپکا
خاموشی میں،
اور چوہے اور زیادہ
چوہوں کی طرح ہو گئے
جو کبھی نہیں ہنستے
جب کہ ہمیں نکال دیا گیا
ہم
جنھوں نے قہقہہ لگایا تھا

ایک اڑنے والی چھپکلی نے
بوجھل آسمان کا چکر لگایا
اور گھوڑے کی دُم اور مکدر کائی
پھولوں کے گملے میں اُگ آئے
ایک نَوم زدہ فیل نما جانور نے
ٹاؤن ہال سے جھانک کر دیکھا
کہیں ہم لوٹ تو نہیں رہے ہیں
ہم جنھوں نے قہقہہ لگایا تھا

ہم لوٹ نہیں رہے تھے
ہم کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک کے کنارے
فٹ پاتھ کے گِھسے ہوے پتھروں پر،
گوداموں اور کارخانوں کے درمیان،
مشین ٹول شاپ اور اسکریپ کے انباروں کے درمیان،
منقّش دیواروں اور خالی مکانوں کے درمیان،
قدم در قدم در قدم
چکراتی ہوئی جکھوں سے گزرتے ہوے،
جھاڑیوں کے درمیان،

چھچھوندروں کے گھروندوں
اور بارودی سرنگوں کے درمیان
چل رہے تھے

اور ایک آدمی
خاموشی میں
ٹھوکر کھاتا ہے
اور پھر کچھ نہیں---
صرف خاموشی

اسی پر ہم نے قہقہہ لگایا تھا

(ا۔ ا۔ س۔)

ہڈیاں

ہم ایک طرف پڑے ہیں
بےکار ہڈیاں،
دیوقامت چھپکلیوں کی پسلیاں،
بلّیوں کے جبڑے،
طوفان کی کولھے کی ہڈی،
تقدیر کی خواہش کی ہڈی

آدمی کے
بڑھتے ہوے سر کو سہارنے کے لیے
ہمیں
ایک ریڑھ کی ہڈی کی تلاش ہے

(ا۔ ک۔)

انسان

کہیں نہ کہیں کوئی گٹھری ہمیشہ ہوتی ہے
جس میں سے کچھ دھواں نکلتا رہتا ہے، کچھ خون
کچھ کراہیں اور کچھ گیت
بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے
اور پرچموں کی پھڑپھڑاہٹ
ایک بٹن گر کر لڑھکنے لگتا ہے
یا شاید ایک سر
یا کچھ اور
کسی کے ہنسنے کی آواز، قے کرنے کی آواز
کوئی کہتا ہے: یہ سب بےکار ہے، آؤ چل کر کچھ پیتے ہیں
کوئی کہتا ہے: ہُرّا!
کوئی کہتا ہے: جب میں جوان تھا۔۔۔
کوئی کہتا ہے: ہاں اُس وقت سب کچھ کتنا مختلف تھا
گٹھری بند ہوتی ہے
اور ایک بار پھر ایسی آواز آتی ہے
جیسے گھونسا مار کر کسی کے دانت توڑے جا رہے ہوں
یا جیسے کوئی لکڑی پر کھٹکھٹا رہا ہو
مٹی کسی روندے ہوئے کتّے کی طرح اینٹھتی ہے

اور اب کوئی جا رہا ہے
بجلی یا سوئی کی نوک سے چوٹ کھا کر

وزنی پتّھر سے چوٹ کھا کر
لفظ سے، لاٹھی سے، نیوٹرون سے،
حماقت سے چوٹ کھا کر
زہر میں بُجھے تیر یا خنجر
یا پیٹ میں ماری گئی لات سے
یا سو بار کچھ نہ ہونے سے چوٹ کھا کر کوئی جا رہا ہے

ایک رات ایک دن
اور دو اور راتیں
وہ بارش کے کسی پاگل قطرے کی طرح بھٹکتا ہے
پانی کی بوچھاڑ کی زد میں گھاس کی طرح دبک جاتا ہے

ایک دانش مند ڈون کیہوٹے
ایک خاموش رولینڈ
ایک جنرل -- عہدے کے نشان کے بغیر
چیتھڑوں سے بنے پُتلے کی طرح ڈھیلا ڈھالا اور چپٹا
وہ کسی بِل، کسی اسپتال، کسی میوزیم کی تلاش میں ہے
مگر چھ بجے کے بعد ساری جگھیں بند ہو جاتی ہیں
وِنڈسر کا قلعہ ہو یا چوہے پالنے کا فارم

اس کی آنکھیں پشت میں کھُبے خنجر کی طرح ہیں
اسے اپنی آواز دھڑکن کی طرح سنائی دیتی ہے:

وہ کیا کر رہے ہیں
میرے بغیر؟

اور یوں ان دو راتوں
اور ایک دن اور ایک رات کے گزر جانے پر

وہ مڑ کر واپس لوٹتا ہے

بس تھوڑی دیر کے لیے---
وہ خود سے کہتا ہے
مگر یہ پوری زندگی کے لیے ہے
ہمیں نہیں معلوم یہ کون ہے
چلو اسے صرف انسان کہہ لیتے ہیں

(ا- ک-)

سیموں دُ بووار (Simone de Bouvoir)

فرانس کی مشہور ادیب، اور فلسفے، فیمینزم اور سیاست کے تعلق سے معروف شخصیت، سیموں دُ بووار ۱۹۰۸ میں پیرس میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے سوربوں یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران دُ بووار کے ساتھی طالب علموں میں عالمِ بشریات کلود لیوی استروس اور فلسفی موریس مرلوپونتی بھی تھے۔ سارتر سے بھی ان کی ملاقات اسی زمانے میں ہوئی۔ دونوں نے فلسفے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ اس وقت دُ بووار کی عمر اکیس برس کی تھی۔ سارتر سے ان کی ملاقات ایک گہرے تعلّق کی ابتدا ثابت ہوئی جسے ان دونوں نے شادی اور اولاد سے ملوّث نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تعلّق سارتر کی موت (۱۹۷۹) تک قائم رہا۔

سیموں دُ بووار کو بنیادی طور پر فیمینزم کی نظریہ ساز کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کی کتاب The Second Sex نے فیمینسٹ فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ دُ بووار کو الجزائر کی تحریکِ آزادی کی حمایت اور ۱۹٦۸ کی طالبِ علموں کی شورش کی تائید کے سلسلے میں بھی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ ویت نام میں امریکا کے جنگی جرائم کی تحقیقات کے لیے برٹرینڈ رسل کے قائم کردہ ٹربیونل میں بھی ایک رکن کے طور پر شامل رہیں۔ ان کے ناول اور خودنوشت سوانح بھی جدید ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے ناول The Blood of Others کو وجودیت کے مکتبِ فکر کا بہترین نمائندہ خیال کیا جاتا ہے۔

اگلے صفحات میں آپ دُ بووار کے ناول The Mandarins کے ایک حصّے کا ترجمہ پڑھیں گے۔ محبّت کی یہ کہانی -- جسے تین قسطوں میں شائع کیا جائے گا -- دُ بووار کی زندگی کے ایک معروف واقعے پر بنیاد رکھتی ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔ ناول کا کردار لوئس بروگی دراصل امریکی ادیب نیلسن ایلگرن کا افسانوی بہروپ ہے جس سے دُ بووار کا تعلّق ۱۹۴۷ میں شروع ہوا اور چار سال تک قائم رہا۔ یہ ناول پہلی بار ۱۹۵۱ میں شائع ہوا تھا۔ محمد عمر میمن نے ناول میں پیش کردہ قصّے اور خودنوشت سوانح میں اس کی اصل کے بیان میں اہم تضادات دریافت کیے جن سے ان کی رائے میں دُ بووار کی شخصیت اور فکر پر چند معنی خیز اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ میمن کے منصوبے میں دونوں تحریروں کے متعلّقہ اقتباسات کا ترجمہ اور ایک طویل مضمون شامل تھا لیکن مصروفیات کے باعث انھیں ہنوز اس منصوبے کی تکمیل کی فرصت نہیں مل سکی۔ سو فی الحال آپ ناول کے ایک حصّے کے ترجمے پر قناعت کیجیے جو، اور معاملات سے قطع نظر، بجائےخود ایک عمدہ ادبی تحریر ہے۔ باقی دو حصّوں کا ترجمہ آئندہ شماروں میں شائع کیا جائے گا۔

سیمون دُبووار

انگریزی سے ترجمہ : محمد عمر میمن

ایک محبّت کی کہانی

ناول "دی مینڈیرِنز" کے چھٹے باب کا ایک پارہ

جب ہمارا جہاز لاگوارڈیا ایرپورٹ پر اترا تو اس وقت میرا سینہ انبساط اور تجسّس سے لبریز تھا۔ اگلے تمام ہفتے میری حالت اس جانور کی سی رہی جو کچھ کرنے کی بےقراری میں مسلسل لگام چبا رہا ہو۔ جی ہاں، تحلیلِ نفسی کے میدان میں حال ہی میں امریکا نے جو کارہائےنمایاں انجام دیے تھے، ان کے بارےمیں بہت کچھ سیکھنا تھا، اور کانگریس کے اجلاسوں کے بارے میں بھی۔ رفقائےکار سے گفتگو بھی کافی کارآمد ثابت ہوئی۔ تاہم میں نیویارک کی سیروسیاحت کی خواہش مند بھی تھی، مگر انھوں نے بڑے تکلیف دہ جوش و خروش کے ساتھ مجھے اس سے باز رکھا۔ انھوں نے مجھے ضرورت سے زیادہ گرم ہوٹلوں، ایرکنڈیشنڈ ریستورانوں، گمبھیر دفتروں، اور بڑے پُرتکلف اپارٹمنٹوں میں گویا باقاعدہ قید کر کے رکھ دیا تھا، جہاں سے فرار ہونا آسان نہ تھا۔ رات کے کھانے کے بعد، جب وہ مجھے میرے ہوٹل پہنچا آتے، تو میں بڑی بےتاب عجلت سے لابی عبور کر کے کسی اَور دروازے سے باہر فرار ہو جاتی؛ منھ اندھیرے اٹھ بیٹھتی اور صبح کے اُجلاس سے قبل تھوڑی بہت مٹرگشت کر آتی۔ تاہم چھیناجھپٹی سے حاصل کی ہوئی آزادی کے ان لمحوں سے میں حسبِ خواہش فائدہ نہ اٹھا سکی؛ جلد ہی مجھ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ امریکا میں تنہائی کی خواہش کرنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ نیویارک سے نکلتے وقت طرح طرح کے اندیشوں اور

وسوسوں نے مجھے آ گھیرا تھا۔ شکاگو، سینٹ لوئس، نیو آرلینز، فلاڈلفیا، دوبارہ نیویارک، بوسٹن، مونٹریال--- یہ ایک شاندار سیاحتی دورہ ثابت ہو سکتا تھا، بشرطےکہ اس سے فائدہ اٹھانے کے ذرائع میرے پاس موجود ہوتے۔ ٹھیک ہے، میرے رفقائےکار نے مجھے ایسے لوگوں کے پتے ضرور دیے تھے جو مجھے اپنے اپنے شہروں کی سیر بہ خوشی کراتے، لیکن یہ لوگ، سب کے سب، ڈاکٹر، پروفیسر، اور ادیب تھے، اور مجھے تو کچھ شک ہی تھا۔

پھر جہاں تک شکاگو کا تعلق ہے، تو کھیل، بہرکیف، شروع ہونے سے پہلے ہی ہارا جا چکا تھا۔ وہاں میرا قیام دو ہی دن کا تھا۔ ایرپورٹ پر دو فضول سی متموّل عورتیں (dowagers) میرا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ مجھے بڑے رسمی سے لنچ پر لے گئیں، جہاں انھی جیسی کئی اور فضول عورتیں موجود تھیں جنھوں نے پورے دن لمحہ بھر کے لیے بھی مجھے اپنی آنکھوں سے دور نہ ہونے دیا۔ لیکچر دینے کے بعد میں نے دو مکلّف شرفا کے درمیان بیٹھ کر جھینگا مچھلی کھائی، اور کھانا ختم ہوتے ہوتے بوریت سے اس بری طرح تھک چکی تھی کہ ہوٹل پہنچتے ہی بستر پر چاروں شانے چت ہو گئی۔

یہ غصہ تھا جس نے اگلی صبح مجھے بیدار کیا۔ "بہت ہو لیا، یہ صورتِ حال اب ختم ہونی چاہیے،" میں نے فیصلہ کیا۔ پھر ٹیلیفون اٹھایا اور کہا: "سخت نادم ہوں۔ معاف کیجیے گا، مجھے زکام ہو گیا ہے اور لگتا ہے کہ آج سارا دن بستر پر آرام کرنا ہو گا۔" پھر خوشی کے مارے میں نے بستر سے جست لگائی۔ لیکن سڑک پر پہنچتے ہی میرے ولولے پر تھوڑی سی اوس پڑ گئی۔ سردی غضب کی تھی۔ سڑک پر ٹرام کی پٹریوں اور سڑک سے اوپر معلّق ریل گاڑی کے درمیان میرے رہےسہے اوسان بھی جاتے رہے۔ گھنٹوں یوں مارے مارے پھرتے رہنا بالکل بےکار ہے۔ اس طرح تو میں کہیں بھی نہیں پہنچ سکوں گی۔ چناں چہ میں نے اپنی پتوں کی کِتّبیا نکالی: لوئس بروگن (Lewis Brogan)، ادیب۔ کچھ نہ ہونے سے تو ممکن ہے یہی بہتر ثابت ہو۔ میں نے ایک بار پھر فون کیا۔ بروگن سے کہا کہ میں بینسن (Benson) گھرانے کی دوست ہوں؛ ممکن ہے ان لوگوں نے اسے لکھ کر بتا دیا ہو کہ میں آنے والی ہوں۔ اچھا، ٹھیک ہے، وہ دوپہر دو بجے میرے ہوٹل کی لابی پہنچ جائے گا۔ "میں خود آ کر تمھیں پک اپ کر لوں گی،" میں نے کہا اور

ٹیلیفون رکھ دیا۔ مجھے اپنے ہوٹل سے نفرت تھی؛ اس میں ہر طرف ڈالروں اور جراثیم کش دوا کی مہک جو پھیلی ہوئی تھی، اور پھر ٹیکسی پکڑ کے کسی متعینہ جگہ پر جا کر کسی سے ملنے کا اپنا الگ لطف ہوتا ہے۔

ٹیکسی نے پل اور پٹریاں عبور کیں، گوداموں سے ہو کر گزری، اور ان سڑکوں سے جن پر ساری کی ساری دکانیں اٹلی سے آ کر بسے ہوئے لوگوں کی تھیں۔ آخرکار وہ ایک گلی کے نکڑ پر جا کر رکی جس میں سے جلے ہوئے کاغذ، مرطوب مٹی، اور افلاس کی ملی جلی بُو اٹھ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ایک پورچ یا چھتّے کی طرف اشارہ کیا جو اینٹوں کی دیوار سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ "یہ رہا۔" میں ایک جنگلے کے سہارے سہارے چلنے لگی۔ میرے بائیں طرف ایک شراب خانہ (Saloon) تھا جس پر سرخ رنگ کی نیون‌سائن لگی ہوئی تھی، جو روشن نہ تھی۔ یہ "شلِتز" (بیئر) کا اشتہار تھا۔ دائیں طرف، ایک دیوہیکل بِل بورڈ پر، ایک مثالی امریکی کنبہ گرم گرم سیریل (cereal) کے پیالے سے اٹھتی بھاپ میں ناکیں ڈالے بڑی طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مشامِ جاں معطّر کر رہا تھا۔ ایک چوبی زینے کے نیچے پڑے ہوئے کوڑےکرکٹ کے ڈبّے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں زینہ چڑھ کر اوپر آئی۔ پورچ میں مجھے ایک کھڑکی دار دروازہ ملا جس کی اندرونی طرف ایک زرد جِھلمِلی لٹکی ہوئی تھی۔ "تو یہی ہے۔" لیکن اچانک میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ثروت میں ہمیشہ دکھاوے کا رنگ پایا جاتا ہے، لیکن عُسرت کی زندگی ایک بہت ہی نجی چیز ہوتی ہے؛ پتا نہیں کیوں، اس کھڑکی کے شیشے پر دستک دینا نامناسب سا لگا۔ میں نے ایک ہچکچاتی ہوئی نظر اینٹوں کی دیواروں کی قطار پر ڈالی جس پر ایسے ہی دوسرے زینے اور سرمئی پورچ بڑی اکتا دینے والی یک رنگی سے چپکے ہوئے تھے۔ پورچوں کے اوپر مجھے ایک دیوقامت سرخ و سفید اسطوانہ (cylinder) نظر آیا؛ یہ گیس ٹینک تھا؛ میرے نیچے، زمین کے ایک بنجر مربّعے کے بیچوں‌بیچ ایک سیاہ درخت کھڑا تھا، جس کے دامن میں بچوں کے کھیلنے کی ایک چھوٹی سی پَوَن چکی تھی، جس کے پنکھے نیلے رنگ کے تھے۔ دور فاصلے میں کوئی ریل گاڑی گزر رہی تھی؛ پورچ لرز اٹھا۔ میں نے دستک دی۔ دروازے پر ایک قدرے طویل قامت، قدرے نوجوان آدمی نمودار ہوا، جس کا سینہ ایک چرمی جیکٹ کے باعث

کچھ اکڑا اکڑا سا لگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف اچنبھے سے دیکھا۔

"گھر مل گیا تمھیں؟"

"لگتا تو یہی ہے۔"

ایک زرد سے کچن کے بیچ ایک سیاہ رنگ کا اسٹوو چٹخ پٹخ جل رہا تھا۔ لائنولیم کے فرش پر ہر طرف اخبار بکھرے پڑے تھا، اور یہ بات میری نظر میں آ گئی کہ وہاں کوئی ریفریجریٹر نہیں تھا۔ بروگن نے اخباروں کی طرف مبہم سا اشارہ کیا، "تھوڑی بہت صفائی وغیرہ کی کوشش کر رہا تھا۔"

"میں مخل تو نہیں ہو رہی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" وہ میرے سامنے کھڑا تھا؛ چہرے پر بوکھلاہٹ کا تاثر تھا۔ "کیوں بھئی، تم کیوں نہیں چاہتی تھیں کہ میں آ کر ہوٹل سے تمھیں پک اپ کر لوں؟"

"بڑی واہیات جگہ ہے۔"

آخرکار مسکراہٹ کی رمق بروگن کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ "مگر وہ تو شکاگو کا سب سے حسین ہوٹل ہے۔"

"بالکل۔ ضرورت سے زیادہ قالین، ضرورت سے زیادہ پھول، ضرورت سے زیادہ لوگ، ضرورت سے زیادہ موسیقی، ضرورت سے زیادہ ہر چیز۔"

بروگن کی مسکراہٹ اب رینگ کر اس کی آنکھوں تک آ گئی تھی۔ "آؤ، دوسرے کمرے میں چلیں۔"

جس چیز پر سب سے پہلے میری نظر پڑی وہ میکسیکن کمبل تھا، اور اس کے بعد وین گو کی زرد کرسی، کتابوں، گراموفون، ٹائپ رائٹر پر۔ اس کمرے میں زندگی گزارنا اچھا رہا ہو گا، ایسا کمرہ جو نہ کسی جمال پرست کا اسٹوڈیو تھا اور نہ ایک مثالی امریکی گھر کا نمونہ۔ میں نے بڑے جوش و خروش سے کہا، "اچھا لگ رہا ہے یہاں۔"

"واقعی؟" بروگن کی آنکھوں نے دیواروں سے سوال کیا۔ "جگہ بڑی نہیں۔" ایک اور خاموشی در آئی، جس کے بعد اس نے بڑے اتاؤلےپن سے کہا، "کوٹ نہیں اتارو گی؟ ایک پیالی چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے پاس چند فرانسیسی گانوں کے ریکارڈ ہیں۔ سنو گی؟ شارل ترنے (Charles Trenet) کے کچھ ریکارڈ؟"

شاید یہ اس بڑے سے اسٹوو میں چٹختی لکڑیوں کا نتیجہ رہا ہو، یا اس سیاہ درخت کی پرچھائیں کا جو فروری کے آفتاب سے سنہریائی ہوئی جھلملی پر لرز رہی تھی، کہ میرے ذہن میں سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا: "اس میکسیکن کمبل پر بیٹھے بیٹھے تمام دن گزار دینا کتنا پُرلطف ہو گا!" لیکن میں نے تو شکاگو کی سیر کی غرض سے بروگن کو فون کیا تھا۔ چناں چہ میں نے قطعیت سے کہا "میں شکاگو دیکھنے کی نیت سے آئی ہوں؛ کل صبح واپس جا رہی ہوں۔"

"شکاگو بہت بڑا شہر ہے۔"

"تو بس تھوڑا سا ہی دکھا دو۔"

اس نے اپنی چرمی جیکٹ کو چھوا اور پریشان سی آواز میں کہا، "کیا اس کے لیے مجھے کپڑے وپڑے بدلنے ہوں گے؟"

"بےوقوف نہ بنو! مکلّف کپڑوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

اس نے بڑی گرمی سے احتجاج کیا، "میں نے ساری زندگی کبھی مکلّف کپڑے نہیں پہنے۔"

پہلی بار ہم ساتھ ساتھ مسکرا دیے، تاہم وہ اب بھی کچھ بےچین سا لگ رہا تھا۔

"مذبح خانے دیکھو گی؟"

"نہیں۔ چلو بس سڑکوں پر گھومتے ہیں۔"

بےشمار سڑکیں تھیں اور دیکھنے میں سب ایک جیسی؛ ان کے دورویہ لکڑی کے چوکھٹے والے تھکے تھکے سے گھر اور حقیر سے صحنچے سُبربن باغوں کی نقّالی کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم تیر کی طرح سیدھی اور ہُوحق شاہراہوں سے بھی گزرے؛ ہر طرف غضب کی سردی تھی۔ بروگن نے فکرمندی سے اپنے کان چھو کر دیکھے۔ "بالکل لکڑی کی طرح اکڑ گئے ہیں؛ کوئی دم جاتا ہے کہ ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

میں نے اس کی حالت پر رحم کھایا اور بولی، "چلو کسی بار میں چل کر جسم گرما لیں۔"

ہم ایک بار میں داخل ہوے۔ بروگن نے جِنجر ایل کا آرڈر دیا؛ میں نے بربن وِسکی کا۔ جب ہم دوبارہ باہر نکلے تو سردی اب بھی اُتنی ہی سخت

تھی۔ ہم ایک اَور بار میں جا گھُسے اور گپّیں مارنے لگے۔ اس نے حملے کے بعد چند ماہ آردین (Ardennes) کے ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں گزارے تھے، چناں چہ مجھ سے فرانس، جنگ، فوجی قبضے اور پیرس کے بارے میں بہت سے سوال کر ڈالے، میں نے بھی سوال کیے۔ وہ اس بات پر خوش نظر آ رہا تھا کہ اس کی بات سننے والا کوئی موجود تھا، تاہم اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے حجاب بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جملے جھجھک جھجھک کے ترتیب دیتا اور پھر اتنے جوش سے انھیں میری طرف اچھالتا کہ ہر بار مجھے لگتا جیسے کوئی تحفہ وصول کر رہی ہوں۔ وہ شکاگو کے جنوبی حصے میں پیدا ہوا تھا۔ باپ اصلاً فن لینڈ کا تھا جس کی ترکاری اور پرچون کی دکان تھی۔ ماں کا تعلق ہنگری سے تھا اور یہودی تھی۔ جب امریکا ہولناک سردبازاری (depression) کی زد میں آیا، اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ کئی سال تک وہ ایک بےگھرے اور قلاش کی زندگی گزارتا رہا۔ مال گاڑیوں میں چھپ چھپا کر امریکا کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک ہو آیا، اور ہر قسم کے کام کرتا رہا: خوانچہ فروش، ضرورت آن پڑے تو اٹھائی گیرا بھی۔ ایری زونا میں سڑک کے کنارے کے کسی بھولے بسرے لنچ روم میں، جہاں وہ برتن دھونے پر ملازم تھا، اس نے ایک افسانہ لکھا تھا جو کسی بائیں بازو کے رسالے نے اشاعت کے لیے قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اَور بھی کہانیاں لکھیں۔ اس کے پہلے ناول کی کامیابی کے بعد سے اس کے پبلشر نے اس کے نام وظیفہ جاری کر دیا تھا جس سے اس کی گزراوقات ہو جاتی تھی۔

"میں تمھاری کتاب پڑھنا چاہتی ہوں،" میں نے کہا۔

"اگلی والی بہتر ہو گی۔"

"لیکن یہ والی تو بہرحال لکھی جا چکی ہے۔"

بروگن میرا جائزہ لینے لگا، یوں جیسے کسی الجھاوے میں پڑ گیا ہو۔ "واقعی پڑھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں، واقعی۔"

وہ اٹھا اور کمرے کے دوسرے سرے تک گیا جہاں ٹیلیفون لگا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد واپس آیا اور بولا، "ڈنر سے پہلے پہلے کتاب تمھارے ہوٹل پہنچ

جائے گی۔"

"اوہ، شکریہ۔" میں نے بڑے تپاک سے کہا۔

میں اس کی اس کریمانہ برجستگی سے بُری طرح متاثر ہوئی؛ اور یہی چیز تھی جو مجھے اس میں فوراً بےحد پُرکشش نظر آئی تھی۔ پہلے سے تیار جملے اور رسمی آداب اسے چھو کر بھی نہ گئے تھے؛ اس کی مروّت میں سچی برجستگی تھی، اور یہ ان چھوٹی چھوٹی اختراعات سے مشابہ تھی جو شفقت کے فیضان سے آتی ہیں۔ پہلےپہل مجھے یہ بات خاصی پُرلطف معلوم ہوئی تھی کہ امریکی نوع کے ایک نہایت ٹکسالی نمونے سے -- یعنی بائیں بازو کے ایک خود ساختہ و پرداختہ ادیب سے -- بہ نفسِ نفیس میری ملاقات ہو رہی ہے۔ لیکن اب میں بروگن میں واقعی دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کی کہانیوں سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اسے زندگی پر کسی استحقاق کا دعویٰ نہ تھا، تاہم زندہ رہنے کی ایک بڑی پُرجوش لگن اسے ہمیشہ رہی تھی۔ انکسار اور شوق کا یہ امتزاج مجھے اچھا لگا۔

"تمھیں لکھنے کی تحریک کس چیز سے ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے چَھپا ہوا کاغذ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ میں جب ذرا سا بچہ تھا، کاپیوں میں خبروں کے تراشے چپکا کر اخبار بنایا کرتا تھا۔"

"اور وجہیں بھی رہی ہوں گی؟"

اس نے تھوڑا سا غور کیا۔ "میں طرح طرح کے لوگوں سے واقف ہوں؛ دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کو اس کے غیر سے، عین میں جیسا کہ وہ ہے، واقف کراؤں۔ ہر طرف جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ "میں جب بیس برس کا تھا، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہر شخص مجھ سے صرف جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اس بات نے مجھے غصے سے پاگل کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صرف اسی لیے لکھنا شروع کیا اور اب تک لکھ رہا ہوں۔"

"اور اب بھی اتنے ہی ناراض ہو؟"

"کم و بیش،" اس نے موہوم سی کم آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم سیاست میں فعال ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا بہت۔"

مجموعی اعتبار سے اس کی صورتِ حال بھی قریب قریب رابرٹ اور ہنری جیسی ہی تھی، فرق تھا تو بس اتنا کہ اِس نے جس سکون کے ساتھ اس سے سمجھوتا کیا تھا وہ ذرا کچھ زیادہ ہی انوکھا تھا۔ لکھ لکھا کر، ریڈیو پر بول بال کر، یا کبھی کبھار کسی جلسے جلوس میں کسی بےجا بات کے خلاف دل کا غبار نکال کر اس کی پوری تشفّی ہو جاتی تھی۔ جی ہاں، مجھے ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ یہاں عبقری حضرات بڑی پُرامان زندگی گزار سکتے ہیں کیوں‌کہ انھیں خوب معلوم ہے کہ وہ بالکل بےبس ہیں۔

"تمھارے دوستوں میں ادیب بھی ہیں؟"

"ارے نہیں بھئی!" اس نے بڑے قطعی انداز میں کہا۔ مسکرایا۔ "مگر میرے دوست ہیں جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ میں ٹائپ رائٹر پر فضول کی کھٹ کھٹ کر کے پیسا بنا رہا ہوں، خود بھی لکھنا لکھانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ ادیب نہیں بن سکے۔"

"کچھ پیسے ویسے کمائے انھوں نے؟"

اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "ایک نے مہینے بھر میں پورے پانسو صفحے ٹائپ کر مارے۔ انھیں چھپوانے میں اس کی پائی پائی خرچ ہو گئی ہو گی۔ بیوی نے لکھنے کی ممانعت کر دی۔ چناں‌چہ وہ اپنے پرانے پیشے کی طرف لوٹ گیا؛ پھر سے گرہ کٹ بن گیا۔"

"نفع بخش پیشہ ہے؟"

"اس کا انحصار چند باتوں پر ہے۔ یہاں، شکاگو میں، کمپِٹیشن بہت زیادہ ہے۔"

"تم بہت سے جیب کتروں سے واقف ہو؟"

اس نے مجھے کسی قدر تمسخر کی نظر سے دیکھا۔ "آدھ درجن کے لگ بھگ۔"

"کسی جُرم پیشہ شخص (ganster) سے بھی؟"

بروگن کا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔ "سارے گینگسٹرز حرامی ہیں۔"

اس نے بڑی تفصیل سے بتانا شروع کیا کہ گزشتہ برسوں کی ہڑتالوں کو توڑنے میں ان گینگسٹرز کا کیا کردار رہا ہے۔ پھر اس نے مجھے ان کے پولیس، سیاست، اور تجارت سے تعلّق کے بارے میں کئی کہانیوں سنائیں۔ وہ

بہت تیزی سے بول رہاتھا اور مجھے سمجھنے میں تھوڑی سی دقت ہو رہی تھی۔ تاہم یہ سب مجھے اتنا ہی جوش آفریں لگا جتنی ایڈورڈ جی رابنسن کی کوئی فلم۔ اچانک وہ رک گیا، پھر بولا، "بھوک لگی ہے؟"

"تم نے یاد دلا دیا تو، ہاں، بڑے زور کی،" میں نے جواب دیا۔ "تمھیں تو واقعی دنیابھر کی کہانیاں آتی ہیں،" میں نے زندہ دلی سے اضافہ کیا۔

"نہ آتی ہوتیں تو گھڑ لیتا،" اس نے کہا، "تاکہ وہ لطف اٹھا سکوں جو تمھیں ان کو سنتے ہوے دیکھ کر آتا ہے۔"

آٹھ سے آگے کا وقت ہو رہا تھا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر گیا تھا۔ بروگن مجھے ایک اطالوی ریستوران میں کھانا کھلانے لے گیا۔ پیتزا کھاتے ہوے میں حیرت سے سوچنے لگی کہ میں اس کے ساتھ خود کو اس قدر باآرام کیوں محسوس کر رہی ہوں۔ میں اس کے بارے میں جانتی ہی کیا تھی، تاہم وہ ذرا بھی تو اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی فکروں سے آزاد غربت رہی ہو۔ تکلف، نفاست، اور اچھے آداب دوری پیدا کرتے ہیں، لیکن جب بروگن نے اپنی جیکٹ کے بٹن کھولے، اور مجھے اندر اس کا گِھساپِٹا سویٹر نظر آیا، اور پھر جب اس نے بٹن بند کیے، تو مجھے اپنے قریب ایک ایسے جسم کی اطمینان بخش موجودگی کا احساس ہوا جو گرم بھی ہو سکتا تھا، اور سرد بھی؛ ایک زندہ جسم۔ اس نے اپنے جوتے خود ہی چمکائے تھے؛ اس کی نجی (intimate) زندگی کا حصہ بننے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ آدمی ان پر بس ایک نظر ڈال لے۔ جب پیتزیریا سے نکلتے ہوے اس نے برفیلے فٹ پاتھ پر سہارا دینے کے لیے میرا بازو تھام لیا، تو مجھے اس کی حرارت اچانک بےحد مانوس لگی۔

"چلو چلیں! تمھیں تھوڑا بہت شکاگو دکھا ہی دوں،" اس نے کہا۔

ہم ایک برلیسک شو (burlesque show) میں گئے اور موسیقی کی تان پر عورتوں کو برہنہ ہوتے ہوے دیکھا؛ ہم ایک چھوٹی سی نیگرو رقص گاہ میں جاز سننے گئے؛ ایک بار میں جو دیکھنے میں flaphouse لگتی تھی، ہم نے شراب کے متعدد جام چڑھائے۔ بروگن سبھی کو جانتا تھا: برلیسک ہاؤس میں پیانونواز کو، جس کی کلائیوں پر گودنے کے نشان تھے، رقص گاہ میں ٹرمپٹ بجانے والے نیگرو کو، اور بار میں موجود آوارہ قلاشوں (bums)،

غیرسفیدوں (coloured)، اور بوڑھی طوائفوں کو۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو ہماری میز پر آنے کی دعوت دی، انھیں باتیں کرنے پر اکسایا، اور میری طرف مسرت سے دیکھا کیوں کہ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ میں خوب محظوظ ہو رہی ہوں۔ جب ہم دوبارہ سڑک پر آئے، میں نے بڑے جوش سے کہا، "امریکا میں یہ میری بہترین شام ہے؛ شکریہ۔"

"اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو تمھیں دکھانا چاہتا ہوں۔" بروگن نے کہا۔

رات قریب الختم تھی؛ جلد ہی پو پھٹے گی، اور شکاگو ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے دور ہو جائے گا۔ لیکن زمین سے اوپر چلنے والی ٹرین کے آہنی فریم نے اس کوڑھ جیسے مقام کو ہماری نظر سے مخفی رکھا جو تھوڑا تھوڑا کر کے آسمان کو نگلنے لگا تھا۔ بروگن میرا بازو تھامے ہوے تھا۔ ہمارے آگے، ہمارے پیچھے سیاہ محرابیں خود کو ابد تک دہراتی چلی جا رہی تھیں؛ لگتا تھا وہ ساری دنیا کے گرد حلقہ بنائے کھڑی ہیں اور ہم تاقیامت ان کے زیرِسایہ چلتے رہیں گے۔

"ایک دن کافی نہیں،" بروگن نے کہا، پھر تیزی سے یہ اضافہ اور کر دیا، "میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا کہ تمھیں دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔"

ہم چپ چاپ چلتے ہوے ایک ٹیکسی اسٹینڈ تک آئے۔ جب وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لایا تو میں گریز کیے بغیر نہ رہ سکی، تاہم مجھے اس کی سانس اپنے چہرے سے مَس ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

چند گھنٹے بعد جب میں ریل گاڑی میں بیٹھی بروگن کا ناول پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے سختی سے اپنی سرزنش کی۔ "بالکل احمقانہ بات ہے! اِس عمر میں؟" تاہم کسی باکرہ کی طرح میرا منھ جھنجھنا رہا تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے مرد کا بوسہ نہیں لیا تھا جس کے ساتھ ہم بستر نہ ہوئی ہوں؛ اور ہر بار جب اس بوسے کی پرچھائیں یکبارگی میرے ذہن میں چمکی، ایسا لگا کہ میں اپنے حافظے کی انتہائی گہرائیوں میں عشق کی روشن یادوں کو پھر سے دریافت کرنے والی ہوں۔ "میں ضرور واپس آؤں گی،" میں نے فیصلہ کن انداز میں اپنے سے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا، "لیکن اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ یہی نا کہ ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے

گا، اور اس دوسری بار تو مجھے یہ کہنے کی آسودگی بھی میسر نہ ہو سکے گی کہ میں لوٹ کر آؤں گی۔ نہیں، بہتر ہو گا کہ معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔"

شکاگو کے تعلق سے مجھے کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دوستیاں جن کا کوئی مستقبل نہ ہو، اور رخصت کے وقت کی دل سوزیاں، ایک لحاظ سے سیروسیاحت کے لطف ہی کا حصہ ہوتی ہیں۔ میری عادت تھی کہ بڑی سختی کے ساتھ بور لوگوں سے اجتناب کرتی، صرف انھی سے ملتی جو میری تفریحِ طبع کا باعث ہوتے۔ ہم سہ پہر کو لمبی سیر پر نکلتے، شامیں باتیں کرنے اور پینے پلانے میں گزارتے، اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے، دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے؛ اور نہ کوئی افسوس ہوتا نہ ملال۔ زندگی کتنی سادہ، کتنی آسان تھی! نہ کوئی پچھتاوا، نہ کسی قسم کی بندشیں؛ میرے افعال ہوں یا میری حرکات و سکنات، ان کی کوئی حیثیت نہ تھی؛ کوئی مجھ سے نصیحت اور مشورے کا طالب نہ تھا، اور سوائے اپنے من کی ترنگ کی پاس داری کے، مجھے کسی اور اصول سے سروکار نہ تھا۔ نیو آرلینز میں، ایک patio سے اٹھ کر، جہاں میں ڈیکری (کاک ٹیل) پی کر بدمست ہو گئی تھی، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ جہاز پکڑ فلوریڈا جا پہنچی۔ لِنچ برگ میں کار کرائے پر لی اور ریاست ورجینیا کی سرخ زمین پر ہفتہ بھر جہاں تہاں گھومتی پھری۔ نیویارک میں اپنے دوسری بار قیام کے دوران میں نے قسم کھانے ہی کو اپنی آنکھیں بند کی ہوں گی؛ یکایک میں نے ڈھیر سارے لوگوں سے ملاقات کر ڈالی، اور جہاں منھ اٹھا سیر کے لیے نکل گئی۔ میاں بیوی ڈےویز نے مجھے اپنے ساتھ ہارٹ فورڈ چلنے کے لیے کہا اور دو ہی گھنٹے کے اندر اندر میں ان کی کار میں آ براجمان ہوئی۔ امریکی امرا کی کسی دیہاتی قیام گاہ میں چند دن گزارنا کسی نعمتِ غیرمترقبہ سے کم نہ ہو گا! یہ ایک نہایت دل آویز چوبی فریم کا گھر تھا، سفید اور جمکتا ہوا، جس میں ہر طرف کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں۔ مریَم سنگ تراشی کرتی تھی، بیٹی رقص کا سبق لے رہی تھی، اور بیٹا مغلق سی نظمیں کہتا تھا۔ اس کی عمر تیس سال تھی، جِلد کی رنگت بالکل کسی بچے کی سی، بڑی بڑی اور سوگوار آنکھیں، اور گستاخ سی ناک۔ پہلی ہی شام، اپنی ناکام محبتوں کی

قصہ خوانی کے دوران، نَینسی مجھے ایک لمبا سا میکسیکن گاؤن پہناتے ہوے خوب محظوظ ہوئی، پھر اس نے میرے بال کھول کر انھیں میرے شانوں تک گر جانے دیا۔ "تم بال ہمیشہ اِسی طرح کیوں نہیں رکھتیں؟" فلپ نے مجھ سے پوچھا۔ "لگتا ہے جیسے تم جان بوجھ کر سِن رسیدہ نظر آنے کی کوشش کرتی ہو۔" وہ رات گئے تک مجھے رقص میں الجھائے رہا۔ آنے والے چند دنوں میں، اس کی خوشنودی کی خاطر، میں مسلسل ایک نوجوان عورت کا سوانگ بھرتی رہی۔ یہ جو وہ مجھ پر لہلوٹ ہوا جا رہا تھا تو اس کی وجہ مجھے اچھی طرح معلوم تھی؛ میں پیرس سے آئی تھی، اور میرا سِن بھی اتنا ہی تھا جتنا اس کی جوانی کے دور میں مرِیَم کا رہا ہو گا۔ اس کے باوجود میں اس سے کافی متاثر ہوئی۔ وہ میری خاطر دعوتیں کرتا، نت نئے کاک ٹیل ایجاد کرتا، اپنے گٹار پر بڑے پیارے کاؤبوائے گیت بجا کر سناتا، مجھے لے کر ان قدیم Puritan دیہاتوں میں چہل قدمی کے لیے نکل جاتا جنھیں سترھویں صدی میں یہاں آنے والے زائرین نے بسایا تھا۔ میری روانگی سے پچھلی شام اَوروں کے رخصت ہو جانے کے بعد ہم دونوں لِوِنگ روم میں بیٹھے گانوں کے ریکارڈ سنتے اور وِسکی پیتے رہے، اور اس نے، بڑی دل گیر آواز میں، مجھ سے کہا، "کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں نیویارک میں تم سے اچھی طرح واقف نہ ہوا۔ وہاں میں بڑے شوق سے تمھارے ساتھ سیر تفریح کے لیے جاتا۔"

"خیر، یہ اب بھی ممکن ہے،" میں نے کہا۔ "میں دس دن کے اندر اندر واپس نیویارک پہنچ جاؤں گی۔ تم ہو گے وہاں؟"

"میں یہاں سے بھی پہنچ سکتا ہوں۔ تم فون کر دینا،" اس نے میری طرف بڑی گمبھیرتا سے دیکھتے ہوے کہا۔

ہم نے کچھ اَور ریکارڈ سنے؛ پھر وہ میرے ساتھ ساتھ ہال کے بیچ سے ہوتا ہوا میرے کمرے کے دروازے تک آیا۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، لیکن اس نے دبی دبی آواز میں کہا، "مجھے بوسہ نہیں دو گی؟"

اس نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا؛ ایک لمحے کے لیے ہم بےحرکت رہے، گال ایک دوسرے سے بِھڑے ہوے، خواہش سے شَل۔ ٹھیک اسی وقت ہمیں کسی سبک قدم کی آہٹ سنائی دی اور ہم تیزی سے ایک دوسرے سے

جدا ہو گئے۔ مریَم نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ سے ہمیں دیکھا۔

"این صبح تڑکے جانے والی ہے۔ اسے دیر تک مت جگائے رکھنا،" اس نے اپنی دل کش آواز میں کہا۔

"میں بس سونے ہی جا رہی تھی،" میں نے کہا۔

لیکن میں اپنے بستر پر نہ گئی۔ اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور رات کی بےمہک ہوا میں سانسیں لینے لگی؛ ایسا لگتا تھا جیسے مہتاب نے پھولوں کی بوباس کو منجمد کر کے رکھ دیا ہو۔ اگلے کمرے میں مریم محوِخواب تھی -- یا بیدار -- اور میں جانتی تھی کہ فلپ لوٹ کر آنے والا نہیں۔ تاہم رہ رہ کر مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے قدموں کی چاپ سنی ہو، لیکن یہ محض ہوا تھی جو درختوں سے ہو کر چل رہی تھی۔

کینیڈا بہت بےکیف نکلا۔ جب میں دوبارہ نیویارک پہنچی تو بڑی مسرت محسوس ہوئی، اور میں نے جھٹ پٹ فیصلہ کر ڈالا، "فلپ کو فون کرتی ہوں۔" اسی شام میں ایک کاک ٹیل پارٹی پر مدعو تھی جہاں اپنے دوستوں میں سے بیشتر سے میری ملاقات ہونے والی تھی۔ میں نے اپنی کھڑکی سے باہر فلک بوس عمارتوں سے اٹے ہوئے کشادہ منظر پر نظر ڈالی۔ لیکن یہ سب اب میری تشفی کے لیے ناکافی تھا۔ میں نیچے ہوٹل کی بار میں جا پہنچی؛ سیاہی مائل نیلگوں روشنی میں ایک پیانونواز مدھم سروں میں خواب آور، سریلے نغمے الاپ رہا تھا، جوڑے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ویٹر پنجوں کے بل چل رہے تھے۔ میں نے مارٹینی کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگایا؛ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ جو میں بس ابھی ابھی کرنے والی تھی، کوئی بڑی ہوش مندی کی بات نہیں تھی: فلپ کے ساتھ پورا ہفتہ گزارنے کے بعد یہ کہاں ممکن تھا کہ میں شدید پچھتاوا محسوس کیے بغیر اسے چھوڑ کر جا سکتی۔ خیر یوں ہی سہی! فی الحال تو مجھے اس کی شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی؛ باقی رہے پچھتاوے، تو وہ تو ہونے ہی تھے۔ ہونے کیا تھے، ہونے شروع ہو گئے تھے۔ کوئنزبرو کا پل، سینٹرل پارک، واشنگٹن اسکوائر، ایسٹ ریور -- ہفتے کے اندر اندر ان کو بھی مزید کہاں دیکھ سکوں گی۔ پھر ہزار باتوں کی بات تو یہ ہے کہ اگر مجھے چھوڑنے کا غم ہونا ہی ہے تو بہتر ہے کہ یہ کسی زندہ آدمی کی خاطر ہو، کنکرپتھروں

کی خاطر نہیں؛ اس میں نسبتاً کم تکلیف پہنچنے کا امکان ہے، میں نے سوچا۔ میں نے مارٹینی کی چسکی بھری۔ ایک ہفتہ ۔۔ جو نئی دریافتوں کے لیے بےحد کم تھا، اور ان تمام لذتوں کے لیے بھی جن کا کوئی مستقبل نہ ہو۔ نیویارک میں سیاحوں کی طرح مارےمارے پھرنے کی خواہش اب اور نہیں رہی تھی؛ مجھے تو اس شہر میں زندہ رہنے اور باقاعدہ زندہ رہنے کی ضرورت تھی۔ اس طرح، یہ تھوڑا سا میرا ہو جائے گا، اور میں بھی، بدلے میں، اپنی ذات کا کوئی حصہ پیچھے اس میں چھوڑ جاؤں گی۔ مجھے سڑک پر ایک آدمی کا ہاتھ تھام کر چلنے کی ضرورت تھی، ایک ایسے آدمی کا ہاتھ تھام کر جو کم از کم عارضی طور پر ہی میرا ہو۔ میں نے مارٹینی ختم کی۔ اس دورے میں ایک مقام پر ایک آدمی نے میرا بازو تھاما تھا۔ بڑے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور یخ فٹ پاتھ پر چلنا میرے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا، تاہم اس آدمی کے نزدیک مجھے حرارت کا احساس ہوا تھا۔ "ضرور واپس آنا،" اس نے کہا تھا۔ "میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا کہ تمھیں دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔" اور میں واپس نہیں جاؤں گی؛ میں کسی اور بازو کو سختی سے اپنے بازو میں تھام لوں گی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میں بےوفائی کی مجرم ہوں۔ تاہم اس میں شک نہیں تھا کہ ایک طویل رات میں مَیں صرف فلپ ہی کی خواہش کرتی رہی تھی۔ میں ابھی تک اسی کی خواہش مند تھی، اور وہ میرے ٹیلیفون کا منتظر تھا۔ میں اٹھی، چل کر ایک ٹیلیفون بوتھ میں گئی، اور آپریٹر سے ہارٹ فورڈ کا نمبر ملانے کے لیے کہا۔

"مسٹر فلپ ڈےویز۔"

"ذرا انتظار کیجیے، ابھی بلاتی ہوں۔"

اچانک میرا دل بری طرح کانپنے لگا۔ لمحہ بھر پہلے میں فلپ کے ساتھ من مانی کر رہی تھی،س اسے نیویارک بلا رہی تھی، اپنے بستر میں گھسا رہی تھی۔ لیکن فلپ کا اپنا مستقل بالذات وجود تھا، اور یہ میں تھی جو اس کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ میں تن تنہا تھی، غیرمحفوظ تھی، اس تنگ سی کوٹھڑی میں۔

"ہیلو؟"

"فلپ؟ میں این ہوں۔"

"این! تمھاری آواز سن کر کتنا اچھا لگ رہا ہے؟"

وہ فرانسیسی بول رہا تھا، ایک سست رَو کمال کے ساتھ، جو اچانک بڑا بےرحم لگا۔

"نیویارک سے بول رہی ہوں۔"

"جانتا ہوں۔ پیاری این، تم جب سے ہمیں چھوڑ کر گئی ہو، ہارٹ فورڈ مارے بوریت کے کاٹنے لگا ہے۔ تمھارا دورہ اچھا رہا؟"

اس کی آواز کتنی قریب محسوس ہو رہی ہے! میرے چہرے کو چھو رہی ہے۔ لیکن وہ، اچانک، بہت دور لگ رہا ہے؛ میرا ہاتھ سیاہ بیکالائٹ کے رِسیور کے گرد پسیجا ہوا ہے۔ میں بغیر سوچے سمجھے یہ الفاظ داغ دیتی ہوں: "دورے ہی کے بارے میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں۔ تم نے مجھ سے فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ میرے واپس جانے سے پہلے نیویارک آ سکتے ہو؟"

"تم کب جا رہی ہو؟"

"سنیچر کو۔"

"اوہ؟" اس نے کہا۔ "اوہ، اتنی جلدی؟" ایک مختصر سی خاموشی۔ "مجھے اس ہفتے چند دوستوں سے ملنے کیپ کاڈ جانا ہے۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے؟"

"ہاں ، واقعی بڑے افسوس کی بات ہے! تم اپنی روانگی ملتوی نہیں کر سکتیں؟"

"نہیں۔ تم اپنی ملاقات ملتوی نہیں کر سکتے؟"

"نہیں، یہ ناممکن ہے،" اس کی مایوس آواز نے کہا۔

"خیر، تو پھر ان گرمیوں میں تم سے پیرس میں ملاقات ہو گی،" میں نے شائستہ خوش دلی سے کہا۔ "اور گرمیاں اتنی دور بھی نہیں ہیں۔"

"مجھے واقعی بےحد افسوس ہے؟"

"مجھے بھی کچھ کم نہیں۔ خداحافظ، فلپ۔ گرمیوں میں ملاقات ہو گی۔"

"خداحافظ، پیاری این۔ مجھے تھوڑا سا یاد رکھنے کی کوشش کرنا۔"

پسینے سے تربتر میں نے ٹیلیفون کا رِسیور رکھ دیا۔ میرے دل نے پھڑپھڑانا بند کر دیا، بس پسلیوں کے نیچے ایک خالی پن باقی رہ گیا۔ میں

ولسن خاندان کے یہاں چلی گئی۔ وہاں کئی لوگ موجود تھے؛ انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک گلاس تھما دیا، میری طرف دیکھ کر مسکرائے، مجھے میرا پہلا نام لے کر بڑی بےتکلفی سے مخاطب کیا، جھپٹ کر کبھی میرا ہاتھ جکڑ لیا اور کبھی میرا شانہ، اوٹ پٹانگ اِدھر اُدھر مدعو کیا؛ میں نے ملاقاتوں کے مقررہ دن اور وقت اپنی نوٹ بک میں درج کیے--- لیکن سینے کا وہ خالی پن جوں کا توں رہا۔ میں اپنے جسم کی محرومیاں برداشت کر سکتی تھی، لیکن وہ خالی پن، وہ مجھے تقریباً ناقابلِ برداشت محسوس ہوا۔ لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، مجھ سے بات کی۔ میں نے بھی بات کی، میں بھی مسکرائی۔ ایک اور پورا ہفتہ ہم باتیں کریں گے اور مسکرائیں گے، اور اس کے بعد کوئی کبھی میرے بارے میں سوچے گا بھی نہیں، نہ میں کسی کے بارے میں۔ یہ سچ مچ کا ملک ہے، میں سچ مچ جیتی جاگتی ہوں، اور میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گی، کچھ پیچھے چھوڑے بغیر، کچھ ساتھ لیے بغیر۔ اچانک دو مسکراہٹوں کے درمیان مجھے خیال آیا، "شکاگو ہو آؤں تو کیسا رہے گا؟" میں اسی شام بروگن کو فون کر کے کہہ سکتی ہوں، "میں آ رہی ہوں۔"

اگر وہ مجھ سے مزید ملنے کا خواہش مند نہیں تو، خیر، مجھے بتا دے گا۔ اور پھر اس سے ایسا کون سا لمبا چوڑا فرق پڑ جائے گا۔ دو جِھڑکیاں ایک جِھڑکی سے زیادہ بری تو کیا ہوں گی۔ دو اور مسکراہٹوں کے درمیان میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا اور خود کو شرمندہ پایا؛ میں فلپ کو حاصل نہ کر سکی، چناں چہ اب بروگن کی آغوش میں خود کو پھینکنے والی ہوں۔ جُفت کے لیے گرمائی ہوئی کتیا کے اخلاق کو کیا ہوا؟ سچ تو یہ ہے کہ بروگن کے ساتھ ہم بستری کے خیال کی میرے نزدیک اتنی اہمیت نہیں تھی؛ بستر میں کارکردگی کے آداب کے تعلق سے میں اس کا ایک پھوہڑ ہی کی حیثیت سے تصور کر سکتی تھی۔ پھر مجھے اس کا بھی کہاں یقین تھا کہ اس سے دوبارہ مل کر واقعی لطف بھی آئے گا۔ میں نے اس کے ساتھ صرف ایک سہ پہر ہی تو گزاری تھی، اور بالکل ممکن ہے کہ میں کہیں زیادہ بھیانک مایوسیوں کے منھ میں جا رہی ہوں۔ بےشک یہ پورے کا پورا منصوبہ نہایت احمقانہ ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اِدھر اُدھر گھوموں پھروں، کچھ نہ کچھ

کروں، اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے۔ بس اس طرح آدمی سے نت نئی حماقتیں ہو جاتی ہیں۔ بالآخر میں نے نیویارک ہی میں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کر لیا اور بڑی مستعدی سے مختلف مصروفیات کے -- جن میں نمائشیں، کنسرٹ، ڈنر اور پارٹیاں سبھی شامل تھے -- مقررہ دن اور اوقات نوٹ کرتی گئی۔ ہفتہ تیزی سے گزر جائے گا۔ جب میں نے خود کو دوبارہ سڑک پر پایا تو میڈیسن اسکوائر کا گھڑیال نصف شب گزرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اب، بہرکیف، فون کرنے کا وقت نہیں رہا! نہیں، بالکل ہے! شکاگو میں اس وقت رات کے گیارہ ہی تو بجے ہوں گے اور بروگن اپنے کمرے میں پڑھ رہا ہو گا، یا کچھ لکھ لکھا رہا ہو گا۔ میں ایک ڈرگ اسٹور کی روشن کھڑکی کے سامنے آ کر رک گئی۔ "میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا کہ تمھیں دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔" میں اندر داخل ہو گئی، ریزگاری حاصل کی، اور آپریٹر سے شکاگو ملانے کی فرمائش کی۔

"لوئس بروگن؟ میں این دوبریے ہوں۔"

کوئی جواب نہیں ملا۔

"میں این دوبریے ہوں۔ میری آواز سنائی دے رہی ہے؟"

"بالکل ٹھیک سنائی دے رہی ہے۔" پھر آن گھڑ فرانسیسی میں، مسرت سے ایک ایک رکن کو ہکلا کر ادا کرتے ہوئے، اس نے اضافہ کیا، "بوںژور، آن، کماں ساوا؟" (کیسی ہو؟)

آواز اتنی قریب نہ تھی جتنی فلپ کی تھی، تاہم بروگن قدرے کم دور لگا۔

"میں اس ہفتے تین چار دن کے لیے شکاگو آ سکتی ہوں،" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے؟"

"ان دنوں شکاگو میں موسم نہایت شان دار ہے۔"

"لیکن اگر میں آئی، تو صرف تم سے ملنے کے لیے آؤں گی۔ تمھارے پاس کچھ وقت ہے؟"

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے،" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرا وقت سارا میرا اپنا ہی ہے۔"

میں ایک لمحے کے لیے جھجھکی؛ یہ سب کچھ زیادہ ہی سہل ثابت ہو

رہا تھا۔ ایک نے نہ اور دوسرے نے ہاں کہا، اور کیسی یکساں لاتعلقی کے ساتھ۔ لیکن اب پیچھے ہٹنے کا وقت نکل چکا تھا۔ "اچھا تو پھر ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ "کل صبح یہاں سے نکلنے والے پہلے جہاز سے وہاں پہنچ رہی ہوں۔ کسی ہوٹل میں میرے لیے کمرہ طے کر لینا -- اور ہاں، شکاگو کے نفیس ترین ہوٹل میں نہیں۔ تو کہاں ملیں گے؟"

"میں تمھیں لینے ایرپورٹ آ جاؤں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل ملاقات ہو گی۔"

ایک خاموش وقفہ، اور پھر میں وہ آواز صاف پہچان گئی جس نے تین ماہ قبل مجھ سے کہا تھا، "ضرور واپس آنا۔" وہ کہہ رہا تھا، "این! تم سے دوبارہ مل کر مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

"اور مجھے بھی۔ کل ملیں گے۔"

"کل ملیں گے۔"

یہ ہوبہو اسی کی آواز تھی، یہ خود وہی تھا، بالکل ویسا ہی جیسا مجھے یاد تھا، اور اس نے مجھے بھلایا نہیں تھا۔ اس کے قریب مجھے ویسی ہی حرارت دوبارہ محسوس ہو گی جیسی اس سرد دن ہوئی تھی۔ اچانک مجھے فلپ کے نہ کہہ دینے پر بےحد خوشی محسوس ہوئی۔ سب بڑی آسانی سے ہو جائے گا۔ کسی نیم روشن بار میں ہم کچھ دیر باتیں واتیں کریں گے اور پھر وہ کہے گا، "آؤ، میرے گھر چل کر تھوڑا سا آرام کر لو۔" ہم اس میکسیکن کمبل پر پہلو بہ پہلو بیٹھ جائیں گے۔ میں بڑی اطاعت گزاری سے شارل ترنے کے گانے سنوں گی، اور بروگن مجھے اپنی آغوش میں بھر لے گا۔ شاید وہ رات بہت زیادہ پُرجوش ثابت نہ ہو، تاہم مجھے یہ یقین ضرور تھا کہ اس سے اُسے بڑی مسرت حاصل ہو گی، جو خود میری مسرت کے لیے بہت کافی تھا۔ میں سونے چلی گئی، لیکن اس خیال سے میرے اندر شدید ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ایک آدمی بڑے والہانہ طور پر مجھے اپنے سے ہم آغوش کرنے کا منتظر ہے۔

وہ میرا انتظار نہیں کر رہا تھا؛ انتظارگاہ بالکل خالی پڑی تھی۔

"شروعات غلط ہو رہی ہے،" میں نے ہتھے والی نشست پر بیٹھتے ہوے سوچا۔ میں بالکل لاچار تھی اور میں نے بڑی تشویش کے ساتھ اپنے سے کہا کہ میں نے مناسب احتیاط نہیں برتی۔ "بروگن کو فون کروں، یا نہ کروں؟" یہ کھیل میں نے کسی ساتھی کے بغیر ہی کھیلنا شروع کیا تھا، اور اب ایک ایسی مہم میں آ پھنسی تھی جس کی کامیابی کا دارومدار کچھ مجھی پر نہیں رہا تھا۔ بس یہی کر سکتی تھی کہ گھڑی کی سوئیوں کو گھورتی رہوں--- اور وہ ذرا حرکت نہیں کر رہی تھیں۔ اس انفعالی کیفیت سے مجھے خوف آنے لگا۔ میں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ایسی کیا مصیبت ہے؟ اگر بات نہ بنی تو کل صبح واپس نیویارک لوٹنے کے لیے کوئی عذر ڈھونڈ لوں گی اور بھرکیف، آج سے ہفتہ بھر بعد یہ عبوری کھیل ختم ہو جائے گا۔ اپنی پرانی زندگی کے امن و امان میں لوٹنے کے بعد، میں اپنی تمام یادوں پر -- وہ جو دل گیر تھیں، اور وہ بھی جو مضحکہ خیز -- بڑی مروّت سے مسکراؤں گی۔ میری تشویش جاتی رہی۔ پرس کھول کر بروگن کا ٹیلیفون نمبر نکالنے سے پہلے میں سارے ہنگامی دروازوں کو ذہن نشین کر چکی تھی؛ مجھے سارے حادثوں سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی جا چکی تھی۔ جب میں نے دوبارہ سر اٹھایا تو وہ میرے سامنے کھڑا تھا؛ وہ میرے سراپے کو، کل کا کل، اپنے میں جذب کر رہا تھا، اس کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔ میری سِٹّی گم ہو گئی، ایسی کہ دنیا کے آخری سرے پر اس کے بھوت سے مڈبھیڑ ہونے پر بھی نہ ہوتی۔

"آلور؟ کماں ساوا؟" اس نے اپنی بڑی بھیانک فرانسیسی میں پوچھا۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں دبلا نظر آ رہا تھا، لیکن آنکھیں زیادہ جاندار تھیں۔ "ساوا۔" (ٹھیک ٹھاک)۔

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا، اور اسی طرح اپنا منھ میرے لبوں تک لے آیا۔ کھلے بندوں کے اس بوسے پر، جو ایک سرخ دھبّا بروگن کی ٹھوڑی پر تھوپ گیا، مجھے خاصی کلفت محسوس ہوئی۔ "اب تم خوب داغ دار ہو گئے،" میں نے کہا۔ میں نے لپ اسٹک کا دھبّا اپنے رومال سے پونچھ ڈالا۔ "میں نو بجے ہی پہنچ گئی تھی،" میں نے اضافہ کیا۔

"اچھا؟" اس نے ملامتی انداز میں کہا، اور لگا کہ ملامت کا ہدف

سراسر میں ہی تھی۔ "فون پر تو ان لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نیویارک سے پہلا جہاز دس بجے پہنچے گا۔"

"ان سے بھول ہو گئی ہو گی۔"

"ان سے بھول کبھی نہیں ہوتی۔"

"خیر چلو، اب تو میں یہاں ہوں۔"

"ہاں، تم یہاں ہو،" اس نے اقرار کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں بھی بیٹھ گئی۔ نو بج کر بیس منٹ۔ وہ بیس منٹ دیر سے آیا تھا، اور چالیس منٹ پہلے۔ وہ فلینل کا حسین سوٹ اور بڑی ستھری قمیص پہنے ہوئے تھا اور میں تصور کی آنکھ سے اسے اپنے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا دیکھ سکتی تھی؛ میری پذیرائی کا مشتاق، اپنے سراپے کا جائزہ لینے کا بالکل عادی نہیں، اپنے عکس سے سوال کرتا ہوا؛ کبھی بہ نظرِ خودپسندی، کبھی بہ چشمِ حیراں، اضطراب کے عالم میں گھڑی دیکھتے ہوئے اور میں، دغابازی سے، پہلے ہی سے اس کی گھات میں تھی!

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "ہم سارا دن یہیں بیٹھے بیٹھے تو نہیں گزار دینے والے، یا ہیں؟"

"نہیں،" اس نے کہا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا، "چڑیاگھر چلو گی؟"

"چڑیاگھر؟"

"یہاں سے قریب ہی ہے۔"

"وہاں کیا کریں گے؟"

"جانوروں کو دیکھیں گے؛ جانور ہمیں دیکھیں گے۔"

"میں یہاں تمھارے جانوروں کے سامنے اپنی نمائش کرانے نہیں آئی ہوں۔" میں کھڑی ہو گئی۔ "کیوں نہ کسی خاموش سی جگہ چلیں، جہاں مجھے تھوڑی سی کافی اور ایک آدھ سینڈوچ مل جائے؛ پھر بیٹھے ایک دوسرے کو گھورتے رہیں گے۔"

وہ بھی اٹھ گیا۔ "خیال تو اچھا ہے۔"

لیموزین میں، جو ہمیں شہر کے مرکز میں لے جا رہی تھی، ہم یکہ و تنہا تھے۔ بروگن نے میرا سفری تھیلا اپنے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا؛ وہ خاموش تھا، اور فکر نے ایک بار پھر مجھے آ گھیرا۔ چار دن اس اجنبی کے ساتھ بڑی

لمبی مدت ثابت ہوں گے؛ کتنی لمبی مدت! چار دن اس سے واقف ہونے کے لیے بڑی کم مدت ہے!

"پہلے ہوٹل چل کر سوٹ کیس وہاں رکھتے ہیں،" میں نے کہا۔

بروگن نے بڑی ندامت بھری مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔

"تم نے میرے لیے کمرہ رکھوا رکھا ہے نا؟"

وہ قصوروار سا مسکرائے گیا، تاہم اس کی آواز میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو دعوتِ مقابلہ دے رہی تھی۔ "نہیں!"

"نہیں؟ لیکن میں نے فون پر تم سے کہا جو تھا!"

"جو تم کہہ رہی تھیں اس کا آدھا بھی سنائی نہیں دے رہا تھا،" اس نے تیزی سے جواب دیا۔ "تمھاری انگریزی اب پچھلے جاڑوں سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے، اور تم بولتی ہو تو لگتا ہے جیسے مشین گن چل رہی ہے۔ خیر، کچھ نہیں بگڑا۔ ہم تھیلا کلوک روم میں رکھے دیتے ہیں۔" ہم ہوائی کمپنی کے دفتر کے سامنے اتر گئے۔ "یہاں میرا انتظار کرو،" اس نے کہا۔ وہ ایک گھماؤ دروازے سے اندر داخل ہوا، اور میری آنکھوں نے شک و شبہے کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ یہ بُھلاوا غفلت تھی یا کوئی چال؟ یہ بات کہ میری رات اسی کے بستر پر گزرنے والی ہے شاید اس پر بھی اتنی ہی واضح تھی جتنی مجھ پر، تاہم اس خیال سے کہ شام پڑے اگر ہمارا دل نہ چاہ رہا ہوا تو، مجھ پر باقاعدہ سراسیمگی طاری ہو گئی۔ میں نے اپنے سے قسم کھا رکھی تھی کہ ایسے آدمی کے ساتھ سونے کی غلطی کبھی نہ کروں گی جس کے لیے مجھے کوئی خواہش نہ محسوس ہو رہی ہو۔

بروگن کے لوٹتے ہی میں نے بڑی بےقراری سے کہا، "ہمیں کسی نہ کسی ہوٹل ضرور فون کرنا چاہیے۔ رات مجھے ایک لمحے کو بھی نیند نہیں آئی۔ میں نہانا اور تھوڑا سا سستانا چاہتی ہوں۔"

"شکاگو میں کمرہ ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں،" اس نے کہا۔

بس اسی لیے فوراً تلاش شروع کر دینی چاہیے۔"

اسے کہنا چاہیے تھا، "آؤ، میرے گھر چل کر تھوڑا سا آرام کر لو۔" لیکن اس نے تو کچھ نہیں کہا۔ بلکہ مجھے جس کیفےٹیریا میں لے کر آیا وہ ذرا بھی تو اس گرم اور بےتکلف بار جیسا نہیں لگ رہا تھا جس کا میں تصور کیے

بیٹھی تھی؛ وہ تو کسی ریل اسٹیشن کے ریستوراں جیسا لگ رہا تھا۔ بعد میں جب ہم گھومتے گھامتے ایک بار میں جا نکلے، تو وہ بھی کسی انتظارگاہ ہی جیسی نظر آئی۔ کیا ہم سارا دن محض انتظار ہی انتظار میں گزار دیں گے؟ ہمیں کس چیز کا انتظار ہے؟

"وِسکی؟"

"بہ شوق۔"

"سگریٹ؟"

"شکریہ۔"

"میں ایک ریکارڈ لگا آتا ہوں۔"

کاش ہم سکون سے بات چیت ہی کر سکتے، جس طرح پچھلی مرتبہ کی تھی! لیکن بروگن بھلا کہاں نچلا بیٹھنے والا تھا؛ وہ کوکاکولا کی بوتل لینے بار کے کاؤنٹر پر گیا، پھر پانچ سینٹ کا سکہ، اور پھر ایک اَور جوک باکس میں ڈالا، اور سگریٹ خریدے۔ خدا خدا کر کے جب میں اسے ٹیلیفون کرنے کے واسطے بھیجنے میں کامیاب ہوئی تو وہ اتنی دیر غائب رہا کہ مجھے شک گزرا کہ کہیں ہمیشہ کے لیے رفوچکر نہ ہو گیا ہو۔ بہ ظاہر میں اپنی پیش بینیوں میں شدید غلط فہمی کا شکار ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے جان بوجھ کر دِق کرنے پر تلا بیٹھا ہو؛ اس میں تو اس آدمی کی ادنیٰ سی مشابہت بھی نظر نہیں آ رہی تھی جو میرے حافظے میں موجود تھا۔ سرما نے اسے جس سخت سرد تودے میں منجمد کر کے رکھ دیا تھا، بہار نے اسے پگھلا ڈالا تھا۔ ٹھیک ہے، وہ نہ پُرنوازش بن پایا تھا اور نہ نرم خُو، تاہم اس کی وضع قطع میں کم و بیش نفاست آ گئی تھی، اس کے بال یقیناً سنہری تھے، اور آنکھیں واضح طور پر سرمئی سبز۔ اس چہرے میں جو کبھی مجھے بالکل لاتعلق لگا تھا، اب مجھے ایک حساس دَہن، خفیف سے کشادہ نتھنے، اور ایک بےچین کر دینے والی لطافت دکھائی دینے لگی تھی۔

"کمرہ کہیں بھی نہیں ملا،" جب بروگن میرے پہلو میں بیٹھ چکا تو بولا۔ "چناں چہ جھک مار کر ہوٹل ایسوسی ایشن کو فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں دوبارہ فون کر کے پوچھنا ہے۔"

"شکریہ۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"بس یہیں سکون سے بیٹھے رہیں تو کیسا رہے گا؟"

"اچھا تو ایک اَور وِسکی چلے گی؟"

"ٹھیک ہے۔"

"سگریٹ؟"

"شکریہ۔"

"ایک اَور ریکارڈ لگا دوں؟"

"اگر برا نہ مانو تو رہنے دو۔"

خاموشی۔ میں نے حملہ کیا: "نیویارک میں تمھارے دوستوں سے ملی تھی۔"

"نیویارک میں میرے دوست ووست نہیں ہیں۔"

"بالکل ہیں۔ بینسن میاں‌بیوی، وہی جن کی معرفت ہماری ملاقات ہوئی۔"

"اچھا وہ! وہ دوست کہاں ہیں۔"

"ایسا ہی ہے تو تم تین ماہ پہلے مجھ سے ملاقات کے لیے کیوں‌کر راضی ہو گئے تھے؟"

"اس لیے کہ تم فرانسیسی ہو اور مجھے تمھارا نام -- این -- اچھا لگا۔"
ایک مختصر سے لمحے کے لیے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، لیکن پھر بڑی تیزی سے مسکراہٹ پر قابو پالیا۔

میں نے پھر سے کوشش کی۔ "تم ان دنوں کیا کرتے رہے؟"

"روز عمر میں ایک دن اَور بڑا ہوتا گیا۔"

"حقیقت یہ ہے کہ تم پہلے کے مقابلے میں قدرے کم عمر لگ رہے ہو۔"

"گرمیوں والی جیکٹ جو پہنی ہوئی ہے اس لیے۔"

ایک اَور خاموشی، قدرے طویل، اور اس بار میں نے ہاتھ جھاڑ لیے۔
"جیسی تمھاری مرضی۔ چلو کہیں چلیں۔ مگر کہاں؟"

"پچھلی سردیوں میں تم بیس بال کا کھیل دیکھنے کی خواہش مند تھیں،" اس نے اشتیاق سے کہا۔ "اتفاق سے آج ایک کھیل ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو چلیں۔"

اس کی عنایت کہ میری دیرینہ خواہشوں کو یاد رکھا، تاہم اس نے یقیناً ضرور یہ اندازہ کر لیا ہو گا کہ سرِدست مجھے بیس بال سے ذرا بھی دلچسپی نہیں- خیر یوں ہی سہی- ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ انتظار کی گھڑیاں کسی نہ کسی طرح بِتا دیں- کس چیز کا انتظار؟ میں خالی خالی نظروں سے عجیب و غریب کپڑے پہنے ہوے کھلاڑیوں کو بڑے جارحانہ طریقے سے آنکھوں میں کھب جانے والی سبز گھاس پر دوڑتے بھاگتے دیکھتی رہی- میں نے تشویش سے دہرایا: بِتا دیں! جب کہ ضائع کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک لمحہ بھی نہیں! چار دن کتنی مختصر مدت ہے! ہمیں عجلت سے کام لینا چاہیے- آخر ہم کب ایک دوسرے سے ملیں گے؟

"بور ہو رہی ہو؟" لوئس نے پوچھا-

" ٹھنڈ سی لگ رہی ہے-"

"تو چلو کہیں اَور چلتے ہیں-"

وہ مجھے ایک بولنگ ایلی (bowling alley) میں لے گیا، جہاں ہم نے بیئر پی اور گیند کی ٹکر سے پِنوں (pins) کے گرنے کا نظارہ کیا؛ وہاں سے ایک شراب خانے میں، جہاں ایک نہ دو پورے پانچ میکانکی پیانو ایک کے بعد ایک کہنہ اور بوسیدہ موسیقی پیدا کر رہے تھے، اور وہاں سے ایک ایکویریم میں جہاں ہم نے مچھلیوں کو تنفّر سے آنکھیں نکالتے دیکھا- ہم نے ٹراموں کی سواری کی، پھر زمین دوز ریل گاڑی کی، پھر کچھ اَور ٹراموں کی، پھر کچھ اَور زمین دوز ریل گاڑیوں کی- مجھے زمین دوز ریل گاڑی میں سوار ہونا اچھا لگتا تھا- پہلے ڈبے کی کھڑکی کے شیشے سے ہماری پیشانیاں بِھڑی ہوئی تھیں، سر چکرا دینے والی سرنگیں، جن میں زردی مائل نیلے بلب روشن تھے، ہمیں زندہ نگل گئیں- بروگن نے اپنا بازو میرے گرد ڈال دیا، ہماری خاموشی اس خاموشی سے مشابہ تھی جو پُراعتماد عاشقوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے- لیکن سڑکوں پر وہ مجھ سے فاصلے پر ہو جاتا، اور میں اس بات سے دل گیر ہو جاتی کہ ہم خاموش ہیں، اس لیے کہ ایک دوسرے سے کہنے کے لیے ہمیں کچھ نہیں سوجھ رہا- کوئی نصف سہ پہر گزرنے کے آس پاس مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مجھ سے اپنے اندازوں میں واقعی شدید غلطی ہو گئی ہے- کل سے ہفتے بھر بعد آج کا یہ دن ماضی کا

حصہ بن چکا ہو گا اور مجھے اس سے جاں‌بر ہونے کا موقع بھی مل چکا ہو گا؛ لیکن اس سے پہلے مجھے اس دن کو باقاعدہ گھڑی گھڑی کر کے گزارنا ہو گا، اور ان تمام گھڑیوں میں ایک اجنبی بڑی تلوّن مزاجی سے میری قسمت کو ٹھکانے لگاتا رہے گا۔ میں اتنی واماندہ تھی اور اتنی مایوس کہ تنہائی سے زیادہ مجھے کسی چیز کی طلب نہ تھی۔

"مہربانی کر کے،" میں نے کہا، "ایک دفعہ اَور فون کر کے دیکھ لو۔ مجھے واقعی تھوڑی سی نیند کی ضرورت ہے۔"

"میں ہوٹل ایسوسی ایشن کو دوبارہ فون کر کے پوچھتا ہوں،" بروگن نے ایک ڈرگ اسٹور کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ میں باہر کھڑی رہی اور چمک دار سرورقوں والی پیپربیک کتابوں کی ایک پوری قطار کو بےدھیانی سے دیکھتی رہی۔ وہ فوراً ہی بوتھ سے نکل آیا، چہرے پر مطمئن مسکراہٹ تھی۔ "یہاں سے بس دو بلاک کی دوری پر ایک کمرہ تمھارا منتظر ہے۔"

"آہ! شکریہ۔"

ہم نے ہوٹل کا راستا خاموشی سے طے کیا۔ اس نے جھوٹ کیوں نہیں بول دیا؟ "آؤ میرے گھر چل کر تھوڑا سا آرام کر لو" کہنے کا کوئی موقع ہو سکتا تھا تو وہ یقیناً یہی تھا۔ تو کیا اسے بھی اپنی خواہشات کا اعتبار نہیں؟ اپنے جسم کی تنہائی کو زائل کرنے کے لیے میں اس کی حرارت، اس کی پیش قدمی پر تکیہ کیے بیٹھی تھی، لیکن اس نے تو مجھے اس تنہائی کا اسیر ہی رہنے دیا، اور میں ہم دونوں کے لیے کچھ بھی تو نہ کر سکی۔

لوئس ڈیسک پر گیا۔ "میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کمرہ رکھوایا ہے۔"

کلرک نے رجسٹر پر نظر ڈالی۔ "دو نفری؟" اس نے پوچھا۔

"ایک نفری،" میں نے کہہ دیا۔ پھر میں نے رجسٹر میں اپنا نام درج کیا۔ "میرا سوٹ کیس ایرلائنی کے ٹرمنل پر ہے۔"

"میں لے آؤں گا،" لوئس نے کہا۔ "تمھیں کب چاہیے ہو گا؟"

"مجھے دو گھنٹے میں فون کر لینا۔"

کیا مجھے محض گمان ہوا تھا؟ یا اس نے اشاروں ہی میں کلرک کو سمجھابُجھا دیا تھا؟ کیا اس نے کمرہ دو افراد کے لیے رکھوایا تھا؟ اس صورت

میں میرے ساتھ اوپر آنے کا کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ بوس و کنار کے لیے میں بیس پچیس منٹ بہرحال دے ہی دیتی۔ اس کی ان گری ہوئی حرکتوں سے مجھے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی، اس وجہ سے اور زیادہ کہ میں راضی بہ رضا ان کے دام میں آ گئی تھی۔ میں نے باتھ ٹب بھرا اور گرم گرم پانی میں اپنے جسم کو ڈبا دیا، اور سوچنے لگی کہ ہم دونوں نے ابتدا ہی کتنے غلط طریقے پر کی ہے۔ کیا اس میں قصور میرا ہے؟ اس میں کیا شک کہ ایسی عورتیں موجود ہیں جو چھوٹتے ہی کہہ دیتیں، "چلو تمہارے گھر چلیں۔" ناڈین نے ضرور کہہ دیا ہوتا۔ میں ساٹن کے پلنگ پوش پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ابھی سے اس لمحے سے خوف آ رہا تھا جب میں اس کمرے میں سو کر اٹھوں گی، جہاں دانت صاف کرنے والے برش کی شناسائی بھی میری پذیرائی کے لیے موجود نہ ہو گی۔ کتنے ہی مختلف مگر ناقابلِ تمیز کمرے، سوٹ کیسوں کا کھلنا اور بند ہونا، کتنی آمدیں اور روانگیاں، بیداریاں، تاخیریں، دورے، اور پروازیں۔ میں تھک چکی تھی، تین ماہ کے ہر ہر دن سے جس کا کوئی مستقبل نہ تھا، اور ہر صبح، ہر شام، ہر گھنٹے خود کو بارِدگر تخلیق کرنے سے۔ میری سخت تمنا تھی کہ کوئی خارجی قوت مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے "اس" بستر سے وابستہ کر دے۔ کاش وہ اوپر آتا، میرے دروازے پر دستک دیتا، اندر داخل ہو جاتا! میں نے باہر راہداری میں اس کے قدموں کی چاپ کو سننے کی اس بےتابی سے کوشش کی کہ جیسے یہ مشتعل خواہش ہو۔ لیکن کہیں آہٹ تک نہ ہوئی۔ میں نے نیند میں پناہ ڈھونڈی۔

جب میں لابی میں بروگن سے ملی تو اس وقت میری حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ اب جلد ہی اس مہم کے انجام کا فیصلہ ہو جائے گا، اور، کچھ بھی سہی، میں اگلے چند گھنٹوں میں دوبارہ محوِخواب ہوں گی۔ ہم نے رات کا کھانا ایک چھوٹے سے آرام دہ جرمن ریستوران میں کھایا، اور میں زندہ دلی سے باتیں کرتی رہی۔ بعد میں ہم جس بار میں پہنچے، وہ ملائم اودی اودی روشنی کی دھند میں نہایا ہوا تھا؛ وہاں مجھے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اور بروگن اپنی اسی مانوس آواز میں مجھ سے ہم کلام تھا۔

"ٹیکسی تمھیں لے کر چلتی بنی تھی،" وہ کہہ رہا تھا، "اور مجھے

تمھارے بارے میں کچھ بھی تو نہیں معلوم تھا۔ جب میں واپس گھر پہنچا، تو دروازے کے نیچے نیویارکر پڑا ملا، اور اس میں، سائیکی ایٹرِک کانگریس پر ایک مضمون کے بیچوں بیچ مجھے تمھارا نام نظر آیا۔ جیسے تم آدھی رات کو مجھ سے اپنا تعارف کرانے کے لیے لوٹ آئی تھیں۔"

"تو کیا بینسن نے تمھیں میرے بارے میں نہیں بتایا تھا؟"

"بات یہ ہے کہ میں ان کے خط نہیں پڑھتا۔" جب اس نے یہ اضافہ کیا کہ "مضمون میں تمھارا ذکر ایک بےحد ذہین ڈاکٹر کی حیثیت سے کیا گیا تھا،" تو لگا جیسے وہ اس بات سے بڑا لطف اندوز ہو رہا ہو۔

"تمھیں اس پر تعجب ہوا؟"

وہ میری طرف دیکھ کر خاموشی سے مسکرا دیا۔ جب وہ اس طرح مسکراتا تھا، مجھے اس کی سانس بالکل اپنے چہرے کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

"میں سوچا کرتا تھا کہ فرانس میں بڑے مضحکہ خیز ڈاکٹر ہوتے ہوں گے۔"

"جب میں ہوٹل پہنچی تو تمھاری کتاب منتظر ملی۔ میں نے کوشش کی کہ پڑھوں، لیکن بےحد تھکی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اگلے دن ریل گاڑی میں پڑھی۔" ایک لمحے کے لیے میں نے لوئس کا جائزہ لیا۔ "برٹی کے کردار میں بڑی حد تک تم چھپے بیٹھے ہو، ہو نا؟"

"مَیں؟ ارے نہیں بھئی۔ میں کبھی کسی فارم میں آگ نہیں لگانے کا،" بروگن نے طنز سے کہا۔ "آگ اور پولیس کے نام ہی سے میری سٹی گم ہو جاتی ہے۔" وہ یک لخت کھڑا ہو گیا۔ "چلو چل کر پانسا کھیلتے ہیں۔"

جوے کی میز کے پیچھے براجمان افسردہ چشم، سنہرے بالوں والی عورت نے پانسوں کا ڈبا ہمیں تھما دیا۔ بروگن نے چھ کا عدد چنا اور آدھے ڈالر کی شرط بدی۔ دل شکستہ مَیں ہڈی سے بنے ان چھوٹے چھوٹے مکعبوں کو سبز نمدے پر لڑھکتے دیکھتی رہی۔ ابھی جب کہ ہم نے ایک دوسرے کو دوبارہ سے پانا بس شروع ہی کیا تھا، اسے فرار کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں بھی اسے خوف زدہ کر رہی تھی؟ مجھے اس کا چہرہ بیک وقت بےحد گمبھیر اور بےحد غیرمحفوظ نظر آیا؛ میں اس میں کچھ بھی تو دریافت نہ کر

سکی۔ "میں جیت گیا!" اس نے خوش ہو کر کہا، اور پانسوں کا ڈبا میرے حوالے کر دیا۔ میں نے ڈبے کو نہایت تندی سے ہلایا اور لپکے میں فیصلہ کر ڈالا، "میں اپنی اور اس کی رات کو داؤں پر لگا کر کھیل رہی ہوں۔" میں نے پانچ کا عدد چنا۔ میرے منھ میں جیسے چرمی کاغذ کا آستر لگا ہوا تھا، اور میرے ہاتھ پسیجے ہوئے تھے۔ پہلی تیرہ بار پانسا پھینکنے پر پانچ کا عدد سات بار نکلا، پھر تین بار، اور میں ہار گئی۔

"نہایت چُتیاپے کا کھیل ہے،" میں نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمھیں جُوا پسند ہے؟"

"مجھے ہارنے سے نفرت ہے۔"

"مجھے پوکر کا کھیل بہت پسند ہے، لیکن ہمیشہ ہار جاتا ہوں،" بروگن نے ناخوشی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میرے چہرے سے سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو نہیں،" میں نے اس کی طرف سرکشی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ الجھ سا گیا، لیکن میں نے اپنی نظر نہ ہٹائی۔ میں نے اپنی اور اس کی رات کی بازی لگائی تھی، اور بازی ہار گئی تھی۔ بروگن میری مدد کرنے سے گریزاں تھا اور پانسے نے میرے خلاف فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اس شکست کے خلاف کچھ اس شدت سے بغاوت کی کہ یہ اچانک جرأت میں بدل گئی۔

"میں صبح سے،" میں نے کہا، "مسلسل اپنے سے یہ پوچھتی رہی ہوں کہ کیا تمھیں واقعی میرے آنے کی خوشی ہے، لیکن یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔"

"اس میں کیا کلام کہ ہے،" اس نے کہا، اتنے اشتیاق سے کہ مجھے اپنے لہجے کے ضرورت سے زیادہ جارحانہ ہونے پر ندامت محسوس ہوئی۔

"مجھے امید تھی کہ ہو گی،" میں نے کہا، "کیوں‌کہ میں تمھیں دوبارہ پا کر ضرور خوش ہوں۔ آج صبح مجھے اس خوف نے آ گھیرا تھا کہ کہیں میری یادوں نے مجھے دھوکا نہ دیا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجھے واقعی تمھاری یاد آئی تھی۔"

"میں نے تو کبھی اپنی یادوں پر شک نہیں کیا،" اس نے کہا، اور اس کی

آواز ایک بار پھر تنفس کی طرح گرم تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ الفاظ کہہ دیے جو سبھی عورتیں نرمی کے اظہار کے طور پر ادا کرتی ہیں۔ "مجھے تمھارے ہاتھ اچھے لگتے ہیں،" میں نے کہا۔

"اور مجھے تمھارے،" اس نے کہا۔ "اپنے بےبس مریضوں کا بھیجا نکالنے کے لیے یہی ہاتھ استعمال کرتی ہو؟"

"مجھے اپنے دماغ کا آپریشن کرنے دو۔ میرا خیال ہے اسے اس کی ضرورت ہے۔"

"ارے نہیں بھئی، میرا دماغ صرف نیم مفلوج ہی تو ہے۔"

ہمارے ہاتھ اسی طرح چمٹے رہے؛ میں نے شدید جذباتی انداز میں اس نازک پُل کی طرف دیکھا جو ہماری زندگیوں کے درمیان کھڑا تھا، اور میں نے خود سے پوچھا، ایسے میں کہ میرا منھ خشک ہو چلا تھا، "میں ان ہاتھوں سے واقف ہو سکوں گی یا نہیں؟"

دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر بروگن نے کہا، "واپس چل کر بِگ بِلی (Big Billy) کو دوبارہ سننا پسند کرو گی؟"

"ہاں، بالکل۔"

سڑک پر اس نے میرا بازو تھام لیا؛ مجھے معلوم تھا کہ کوئی پل جاتا ہے کہ وہ مجھے اپنے سے چمٹا لے گا۔ اس سخت صبرطلب دن کا پورا بوجھ میرے کندھوں سے پھسل کر دور ہو گیا تھا اور میں انجام کار امن و سکون کی طرف رواں تھی، مسرت کی طرف۔ اس نے یک لخت میرا بازو چھوڑ دیا؛ اچانک اس کاچہرہ ایک کشادہ لیکن نامانوس مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا۔ "ٹیڈی!"

وہ آدمی اور اس کے ساتھ جو دو عورتیں تھیں، سب رک گئے اور اسے اتنی ہی کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ لمحہ بھر بعد میں نے خود کو ایک اجاڑ سے کیفےٹیریا میں ان لوگوں کے ہمراہ ایک میز کے گرد بیٹھے ہوے پایا۔ یہ سب اتنی تیزی سے بول رہے تھے کہ میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا۔ بروگن خوب دل کھول کر ہنس رہا تھا، اس کا چہرہ زندگی کی حرارت سے دمک رہا تھا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری طولانی

سرگوشیوں سے نجات پا جانے پر راحت محسوس کر رہا ہے۔ قدرتی بات
یہ لوگ آخر اس کے دوست ہیں؛ اور باتیں کرنے کے لیے ان کے پاس بہت ک
ہے۔ دوسری طرف اس میں اور مجھ میں مشترک ہے ہی کیا؟ اس کے مق
بیٹھی ہوئی عورتیں جوان اور خوبصورت تھیں۔ کیا یہ اسے پسند ہیں؟ مج
خیال آیاکہ جوان اور حسین عورتیں یقیناً اس کی زندگی میں آئی ہوں
لیکن یہ کیا بات ہے کہ مجھے اس خیال سے اتنی شدید اذیّت پہنچ رہی
حالاں کہ ہم نے ابھی تک ایک دوسرے کا قرینے سے بوسہ تک نہیں لیا؟ مج
واقعی خاصی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ دور، بہت دور، سرنگ کے خاتمے پ
مجھے ویسا ہی ہنگامی دروازہ نظر آیا جس کی موجودگی میں میں نے آ
صبح خود کو محفوظ محسوس کیا تھا۔ لیکن میں تھکن سے اتنی چُور تھ
کہ مجھ میں اس تک پہنچنے کی طاقت نہیں رہی تھی، حتیٰ کہ گھٹنوں کے ب
پہنچنے کی بھی نہیں۔ "نہ چومے جانے پر اتنی واویلا؟" میں نے اپنے سے کہ
کی کوشش کی۔ لیکن یہ نک چڑھا پن ذرا کام نہ آیا۔ اس بات کی اب اہمی
نہیں رہی تھی کہ میری حالت زیادہ مضحکہ خیز ہے یا کم مضحکہ خیز، می
اپنی تائید کی حق دار ہوں یا اپنی لعنت ملامت کی۔ جو کچھ پیش آ رہا ت
میرے قابو سے باہر تھا؛ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوے تھے، میں نے خود ک
ایک غیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ کتنی شدید حماقت ہے! مجھے ت
اب یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں یہاں کس چیز کی تلاش میں آئی تھی
ضرور میرا دماغ چل گیا تھا جو یہ تصور کیے بیٹھی تھی کہ وہ شخص، ج
میرے لیے کچھ نہیں ہے، میرے لیے کچھ ہو سکتا ہے۔ جب ہم دوبارہ سڑک
پر نکل آئے، اور بروگن نے میرا بازو تھام لیا، تو میں فیصلہ کر چکی تھی ک
سیدھی ہوٹل جا کر سو رہوں گی۔

"مجھے خوشی ہے کہ تمھاری ٹیڈی سے ملاقات ہو گئی،" اس نے کہا۔
"جس جیب کترے ادیب کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ یہی ہے۔ یاد ہے؟"

"یاد ہے۔ اور اس کے ساتھ جو عورتیں تھیں، وہ کون ہیں؟"

"میں ان سے واقف نہیں۔" بروگن ایک نکڑ پر آ کر رک گیا تھا۔ "ٹرام
جلدی آ گئی تو ٹھیک، ورنہ ٹیکسی کر لیں گے۔"

"ٹیکسی،" میں نے سوچا۔ "یہ ہمارا بالکل آخری موقع ہے۔ اگر ٹرام آ

گئی، تو میں امید سے ہاتھ دھو لوں گی؛ ہوٹل لوٹ جاؤں گی؟" ایک لامتناہی لمحے کے لیے میں نے ٹرام کی پٹریوں کی طرف دیکھا جو بڑے بھیانک طور پر جگمگا رہی تھیں۔ بروگن نے اشارے سے ایک ٹیکسی کو رکنے کے لیے کہا۔
"اندر چلو،" اس نے کہا۔

مجھے خود سے "اب یا کبھی نہیں" کہنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ وہ مجھے بری طرح بھینچنے لگا تھا، گوشت پوست کی ایک بھٹی میرے ہونٹوں کو محبوس کر رہی تھی، ایک زبان میرے منھ کو ٹٹول رہی تھی، اور میرا جسم اپنی موت سے جاگ رہا تھا۔ میں بار میں داخل ہوتے وقت اس طرح لڑکھڑا رہی تھی جس طرح لعزر (Lazarus) بارِدگر زندہ ہو کر لڑکھڑایا ہو گا۔ سازندے تھوڑی دیر کے لیے سستا رہے تھے اور بِگ بِلی ہماری میز کی طرف نکل آیا اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بروگن، جس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے دمک رہی تھیں، اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگا؛ میں اس کی مسرت میں شریک ہونا چاہتی تھی، لیکن میرا یہ بالکل نیا نیا جسم -- بے حد بڑا، بے حد سوزاں -- ایک بوجھ بن کر راہ میں حائل ہو گیا۔ آرکسٹرا پھر سے مصروف ہو گیا؛ اور میں پراگندہ دماغ اس ٹیپ ڈانسر کو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دیکھتی رہی جس کی ایک ہی ٹانگ تھی، اور جس کے بال چمکیلے اور تیل میں چپڑے ہوے تھے، اور جب میں وِسکی کے گلاس کو لبوں تک لائی، تو میرا ہاتھ لرز رہا تھا۔ بروگن کیا کرے گا؟ کیا کہے گا؟ رہی میں، تو مجھے میں ادنیٰ سی جنبش کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی، اور نہ ایک لفظ ادا کرنے کی۔ ایک مدت کے بعد، جو مجھے بےحد طویل لگی، اس نے شگفتہ آواز میں پوچھا، "یہاں سے اٹھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"واپس ہوٹل جانا چاہتی ہو؟"

ایک سرگوشی میں جس نے میرا حلق چھیل کر رکھ دیا، میں ہکلا کر صرف اتنا کہہ سکی، "میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔"

"اور نہ میں،" اس نے مسکرا کر کہا۔

ٹیکسی میں اس نے پھر میرے ہونٹوں پر یلغار کر دی، بعد میں بولا، "میرے گھر چل کر سونا پسند کرو گی؟"

"بالکل،" میں نے کہا۔ وہ کیا سمجھتا تھا، میں اس جسم کو، جو اس نے مجھے ابھی ابھی عطا کیا تھا، یوں ہی پھینک دینے کی تاب لا سکتی ہوں؟ میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا، اور اس نے اپنی بانہیں میرے گرد حمائل کر دیں۔

اس زرد سے کچن میں جہاں اب اسٹوو میں سے چٹخنے کی آواز نہیں آ رہی تھی، اس نے بڑے ہیجان کے عالم میں مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔ "این! این! یہ بالکل خواب لگ رہا ہے! میں پورا دن اتنا اداس رہا ہوں۔"

"اداس؟ اذیت تو تم مجھے پہنچا رہے تھے! مجھے چومنے تک کا فیصلہ نہ کر سکے۔"

"واہ، میں نے تمھیں بالکل چوما تھا، اور تم نے اپنے رومال سے میری ٹھوڑی پونچھ دی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا پہلا قدم ہی غلط پڑ رہا ہے۔"

"واہ کہیں انتظارگاہ میں بھی چوما جاتا ہے! تم کو چاہیے تھا کہ مجھے یہاں لے آئے ہوتے۔"

"لاتا کیسے؟ تم خود ہی ہوٹل میں کمرہ لینے پر مصر تھیں۔ میں نے پہلے ہی سے سب کچھ طے کر رکھا تھا۔ میں رات کے کھانے کے لیے ایک بڑا سارا اسٹیک بھی خرید لایا تھا، اور دس بجے یہ کہنے والا تھا کہ کمرہ ڈھونڈنے کا وقت نکل چکا ہے۔"

"مجھے پتا تھا،" میں نے کہا۔ "لیکن میں ذرا محتاط واقع ہوئی ہوں؛ فرض کرو ہم ایک دوسرے کی بازیافت نہ کر پاتے، تو پھر؟"

"ایک دوسرے کی بازیافت۔۔۔ کیا مطلب؟ میں نے تمھیں کھویا ہی کب تھا۔"

ہم منھ میں منھ دیے بول رہے تھے اور اس کی سانسیں میرے ہونٹوں کو چھو رہی تھیں۔ میں بڑبڑائی، "میری تو اس خیال ہی سے جان نکلی جا رہی تھی کہ کہیں ٹرام نہ آ جائے۔"

وہ شیخی مارتے ہوئے ہنسا، "میں ٹیکسی لینے کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔" اس نے میری بھنووں، میری پلکوں، میرے گالوں کو چوما، اور مجھے ساری زمین گھومتی محسوس ہوئی۔ "تم بری طرح تھکی ہوئی ہو۔ بستر پر آ جاؤ،" اس نے کہا۔ اچانک اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ "تمھارا سوٹ کیس؟" اس

نے کہا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک میں کپڑے اتارتی رہی وہ کچن میں ہی رہا؛ پھر میں چادر میں جا گھسی، میکسیکن کمبل کے نیچے۔ میں اس کے اِدھر اُدھر چلنے، چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے، الماریاں کھولنے اور بند کرنے کی آواز سنتی رہی، جیسے ہم وہ میاں بیوی ہوں جنھیں شادی کیے زمانہ بیت گیا ہو۔ ہوٹلوں کے کمروں یا مہمانوں کے لیے مخصوص کمروں میں اتنی بہت سی راتیں گزارنے کے بعد اس اجنبی بستر میں مانوسیت کا وہ احساس بےحد پُرآسائش تھا؛ وہ مرد جو خود میں نے چُنا تھا اور جس نے مجھے، بس اب میرے پہلو میں آ کر دراز ہونے ہی والا تھا۔

"ارے یہ کیا! بستر میں پہنچ بھی گئیں؟" بروگن نے کہا۔ اس کے بازو دھلی ہوئی چادروں وغیرہ سے لدے پھندے تھے، اور اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میں چاہتا تھا ذرا چادریں وادریں بدل دوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" وہ دروازے ہی میں کھڑا رہا، اپنے آرائشی بوجھ پر خجل۔ "میں بالکل مزے میں ہوں،" میں نےکہا اور گرم گرم چادر کو اپنی ٹھوڑی تک تان لیا، وہ چادر جس کے نیچے وہ کل رات سویا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا، پھر لوٹ کر آیا۔

"ایں؟"

اس کے اندازِ تکلم نے مجھے بری طرح متاثر کیا۔ اس نے خود کو مجھ پر ڈال دیا اور میں نے پہلی بار اس کا نام لیا، "لوئس؟"

"ایں! میں بہت خوش ہوں؟"

پل کی پل میں اس کا بھونڈاپن اور حجاب دونوں رخصت ہو چکے تھے۔ اس کی شہوت نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ میں جو ایک مدت سے بےذائقہ اور بےہیئت رہی تھی، پھر سے چھاتیوں، شکم، اور گوشت پوست کی مالک بن گئی تھی؛ میں روٹی کی طرح توانائی بخش تھی، اور مٹی کی طرح خوشبودار۔ یہ سب اپنی تاثیر میں اتنا معجزاتی تھا کہ مجھے اپنے وقت اور اپنی لذت کی پیمائش کا خیال تک نہ آیا؛ بس اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں کے سو جانے سے قبل مجھے پو پھٹنے کی دھیمی چہچہاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

کافی کی مہک نے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور بستر کے قریب کرسی پر اپنے نیلے اونی لباس کو ایک خاکستر جیکٹ کی آغوش میں پڑا دیکھ کر مسکرا دی۔ سیاہ درخت کی پرچھائیں پر پتے اگ آئے تھے جو چمک دار جِھلمِلی پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ لوئس نے میرے ہاتھ میں ایک گلاس تھما دیا اور میں ایک ہی گھونٹ میں سارا اورنج جوس پی گئی، جس کا مزہ، اس صبح، افاقہ بخش تھا -- گویا عشرت پسندی کوئی مرض ہو، یا جیسے میری ساری زندگی ایک طویل بیماری رہی ہو، جس سے میں نے بس ابھی ابھی اٹھنا شروع کیا ہو۔

وہ اتوار کا دن تھا اور اس سال یہ پہلا دن تھا کہ سورج شکاگو پر چمک رہا تھا۔ ہم جھیل کے کنارے گھاس پر آ بیٹھے۔ جھاڑیوں میں بچے کھیل میں امریکی انڈینز کی نقل اتار رہے تھے، اور بہت سے چاہنے والے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھے ہوئے تھے؛ پانی کی پُرسکون سطح پر کشتیاں بےآواز پھسلتی جا رہی تھیں؛ سرخ اور زرد رنگ کے چمکیلے کھلونوں جیسے چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ لوئس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "دو ماہ ہوئے میں نے تمھارے بارے میں ایک نظم کہی تھی---"

"دکھاؤ۔"

مجھے اپنے دل میں خفیف سا کِھنچاؤ محسوس ہوا۔ وین گو کی ری پروڈکشن کے نیچے، کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے یہ شعر اُس اجنبی عورت کے واسطے کہے تھے جس نے اس کے لبوں سے اپنے لبوں کو مَس نہیں ہونے دیا تھا۔ پورے دو ماہ تک وہ اس عورت کو بڑے نرم و گداز جذبات کے ساتھ یاد کرتا رہا تھا، اور اب مَیں وہ عورت نہیں رہی تھی۔ اسے میرے چہرے پر کوئی پرچھائیں ضرور نظر آئی ہو گی، جبھی تو اس نے بڑے تردّد سے کہا، "مجھے نظم تمھیں نہیں دکھانی چاہیے تھی۔"

"بالکل دکھانی چاہیے تھی،" میں نے کہا۔ "مجھے بہت اچھی لگی۔" میں کسی نہ کسی طرح مسکرانے میں کامیاب ہو گئی۔ "لیکن وہ ہونٹ اب تمھارے ہیں۔"

"ہاں اب، آخرکار،" وہ بولا۔

اس کی آواز کی حرارت نے میری ڈھارس بندھائی۔ اُس سرما میرا لیے دیے دہنا اسے سخت ناگوار گزرا تھا، لیکن اب، ظاہرا طور پر، وہ کافی مسرور نظر آ رہا تھا۔ کبیدہ خاطر ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی؛ وہ میرے بالوں سے کھیل رہا تھا، محبت سے چھلکتے ہوے سادہ الفاظ ادا کر رہا تھا، تانبے کا پرانا چھلا میری انگلی میں پہنا رہا تھا۔ میں نے چھلّے کی طرف دیکھا، ان تقریباً بُھلائے ہوے لفظوں کو ایک عجیب اجنبی زبان میں ادا ہوتے ہوے سنا؛ اور اپنے عارض کے نیچے ایک اجنبی دل کو مانوسی سے دھڑکتے ہوے سنا۔ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی گئی؛ اتنا ہی کافی تھا کہ میں بس مَیں ہی رہوں، اور ایک مرد کی جنسی خواہش نے مجھے تکمیل کے درجۂ انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ یہ سب اتنا آرام دہ تھا کہ اگر سورج ٹھیک آسمان کے بیچ ٹھہر جاتا، تو ایک ابدیت گزرنے پر بھی مجھے اس کا احساس نہ ہوتا۔

لیکن سورج زمین سے قریب ہوتا گیا، گھاس پر خنکی دراز ہو گئی، جھاڑیوں پر خاموشی اُتر آئی۔ کشتیاں سو گئیں۔ "تمھیں سردی لگ جائے گی،" لوئس نے کہا۔ "تھوڑا سا چل پھر نہ لیں؟"

بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ میں پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑی تھی، جو میری اپنی حرارت سے گرمائے ہوے تھے، اور میرا بھی ایک جسم تھا، جس میں حرکت کرنے کی صلاحیت موجود تھی، جو جگہ گھیرے ہوے تھا۔ پورا دن یہ جسم ایک ناموجودگی، ایک مَنفِیت رہا تھا؛ یہ رات کا منتظر تھا اور لوئس کی چھیڑخانی کا۔

"ڈنر کہاں کھاؤ گی؟" اس نے پوچھا۔ "ہم کھانا کھانے باہر بھی جا سکتے ہیں، یا چاہو تو یہیں میرے ہاں۔"

"کہیں باہر چلتے ہیں۔"

وہ سارا دن اتنا اداس رہا تھا، اتنا نرم و گداز، کہ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے مزید ملائمت کو سہنے کی مجھ میں تاب نہ رہی ہو۔ ہمارا ماضی پیچھے صرف چھتیس گھنٹے جاتا تھا، ہمارا سارا افق محض ایک چہرے میں سمٹ کر رہ گیا تھا، اور ہمارا مستقبل ہمارا بستر تھا۔ اس بند

بند سی فضا میں مجھے تھوڑی سی گھٹن کا احساس ہوا۔

"بِگ بِلی نے کل جس ریستوران کا ذکر کیا تھا، وہیں نہ چلیں، کیا خیال ہے؟"

"بڑی دور ہے،" لوئس نے کہا۔

"اس بہانے تھوڑی سی سیر بھی ہو جائے گی۔"

مجھے اپنی توجہ بٹانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی؛ ان بےحد تندوتیز ساعتوں نے مجھے بالکل تھکا دیا تھا۔ ٹرام میں، مَیں لوئس کے کندھے پر سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ گئی۔ میں نے یہ جاننے کی ذرا کوشش نہ کی کہ شہر کے کس حصے میں ہوں؛ بالکل نہیں لگ رہا تھا جیسے دوسرے شہروں کی طرح اس شہر کے بھی مقررہ گلی کوچے اور آمدورفت کے جانے پہچانے ذرائع ہوں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ان رسومات کی پیروی کرتی رہوں جن سے لوئس واقف تھا، اور مقامات خودبخود غیب سے نمودار ہوتے چلے جاتے۔ ڈیلیسا (Delisa) کلب بھی، ایک ارغوانی ہالا پہنے، بس ایسے ہی عدم سے جست بھر کے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی ایک قدِآدم آئینہ پڑتا تھا، جس میں لوئس اور میں اپنے اپنے عکس پر نظر پڑتے ہی ایک ساتھ مسکرا دیے۔ میرا سر اس کے کندھے تک آ رہا تھا؛ ہم جوان اور خوش نظر آ رہے تھے، اور میں نے زندہ دلی سے کہا، "کتنا حسین جوڑا ہے!" اور پھر مجھے دل میں اینٹھن سی محسوس ہوئی۔ نہیں، ہم جوڑا ووڑا نہیں تھے، نہ کبھی ہونے والے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کر سکتے تھے، اور اس کا مجھے سو فیصد یقین تھا۔ لیکن وقت کے کس نقطے پر، روئے زمین کے کس گوشے میں؟ کسی گوشے میں بھی نہیں، بہرکیف، اور مستقبل کی کسی ساعت میں بھی نہیں۔

"ہم ڈنر کے واسطے آئے ہیں،" لوئس نے کہا۔

ہوٹل کا ایک سیاہ بھجنگ نگران ، جو کسی ہیوی ویٹ باکسر سے مشابہ تھا، ہماری قیادت کرتا ہوا ہمیں اسٹیج کے پاس والے ایک بوتھ میں پہنچا آیا۔ تلے ہوئے مرغ سے بھری ہوئی کشتیاں ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ سازندے ابھی نہیں پہنچے تھے، تاہم جگہ کھچاکھچ بھری ہوئی تھی -- چند سفید فام تھے اور بہت سے نیگرو، جنھوں نے سر پر ترکی ٹوپیاں یا طربوش

منڈھے ہوئے تھے-

"انھوں نے طربوش کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"بس یہ اسی قسم کی برادریوں میں سے کوئی برادری ہے،" لوئس نے کہا- "اس علاقے میں ایسی بہت سی برادریاں ہیں- لگتا ہے ان کا کوئی کنونشن وغیرہ ہو رہا ہے اور ہم بھٹکتے ہوئے اس میں آ پہنچے ہیں-"

"یعنی سخت بوریت ہو گی؟"

"آثار تو کچھ یہی کہہ رہے ہیں-"

اس کی آواز میں بیزاری کی کیفیت تھی- اس میں کیا شک تھا کہ خود وہ بھی ہماری طویل عیش کوشی اور اس کے نشاط سے بری طرح نڈھال ہو گیا تھا؛ گزشتہ کل سے ہم ایک دوسرے کا مسلسل تعاقب کرتے رہے تھے، ایک دوسرے تک رسائی حاصل کرتے رہے تھے، ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے رہے تھے، اور اب بےحال ہو چکے تھے- بہت کم استراحت، بہت زیادہ ہیجان، بہت زیادہ نشاط انگیز سستی- ہم مکمل خاموشی میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک طویل قامت نیگرو، جس نے طربوش ڈاٹ رکھا تھا، اسٹیج پر جا چڑھا اور بڑی دھواں‌دھار تقریر کرنے لگا-

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

"اپنی برادری کے بارے میں بتا رہا ہے-"

"فلور شو ہو گا، ہو گا نا؟"

"ہو گا-"

"کب؟"

"پتا نہیں-"

اس کے جواب تندوتیز آ رہے تھے؛ ہماری یکساں واماندگی بھی ہمیں ایک دوسرے سے قریب کرنے میں ناکام رہی، اور اچانک مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون کے بجائے کوئی سرمئی، پانی جیسا سیّال بہہ رہا ہو- شاید اپنی کال کوٹھڑی سے فرار کی خواہش کر کے ہم نے بڑی فاش غلطی کی تھی- اندر فضا بڑی بوجھل، بڑی دبیز تھی، لیکن باہر زمین لوگوں سے تہی تھی، اور غضب کی سردی پڑ رہی تھی- مقرر نے شگفتہ آواز میں ایک نام پکارا؛ ایک عورت، جو سرخ طربوش پہنے ہوئے تھی، ایک دم کھڑی ہو گئی

اور حاضرین نے خوب زور زور سے تالیاں بجا کر اس کی پذیرائی کی۔ اس کے بعد ایک اور چہرہ، اور اس کے بعد ایک اور، مجمعے کے اوپر ابھرا۔ تو کیا برادری کے ہر رکن کا اس طرح فرداً فرداً تعارف کرایا جائے گا؟ میں نے لوئس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے سامنے خالی پن سے تک رہا تھا؛ اس کا جبڑا ڈھیلا پڑ کر نیچے کو لٹک رہا تھا، اور وہ ایکویریم کی اُن کینہ پرور مچھلیوں سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

"لگتا ہے یہ تماشا دیر تک جاری رہے گا۔ بہتر ہو گا کہ ہم چلتے بنیں،" میں نے کہا۔

"ہم جلد لوٹ جانے کے لیےاتنی دور نہیں آئے تھے۔" اس کی آوازخاصی درشت تھی؛ بلکہ، سچ پوچھو تو، مجھے ایسا لگا جیسے اس میں عداوت کا شائبہ ہو، جس کی توجیہ کے واسطے تکان کا عذر ناکافی تھا۔ جب ہم جھیل کے کنارے سے اٹھے تو ممکن ہے وہ واپس اپارٹمنٹ جانے کا خواہش مند ہو؛ ممکن ہے اسے اس بات سے گزند پہنچی ہو کہ فوراً بستر پر لوٹ جانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں اس خیال سے مضطرب ہو گئی۔ میں نے الفاظ کے سہارے اس کے قریب آنے کی کوشش کی۔

"تھک گئے ہو؟"

"نہیں۔"

"بوریت محسوس ہو رہی ہے؟"

"میں بس انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہم یہاں بیٹھ کر دو گھنٹے اس طرح تو انتظار نہیں کرنے والے، یا کرنے والے ہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

اس کا سر چوبی پارٹیشن سے ٹکا ہوا تھا، اور اس کے چہرے کا تاثر مبہم اور ماہتاب کی طرح دور تھا؛ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بغیر ایک لفظ کہے اگلے دو گھنٹے کے لیے جھپکی مار جانے کو تیار ہو۔ میں نے ڈبل وِسکی کا آرڈر دیا؛ لیکن اس سے بحال نہ ہو سکی۔ اسٹیج پر سرخ طربوش والی عورتیں جھک جھک کر ایک دوسرے کا اور سامنے حاضرین کا تالیوں کے شور میں آداب بجا لا رہی تھیں۔

"لوئس، چلو واپس چلیں۔"

"نہیں، یہ خیال ہی لغو ہے۔"

"اچھا تو پھر مجھ سے باتیں ہی کرو۔"

"میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں۔"

"میں اب ایک لمحہ اور یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔"

"تمھیں یہاں آنے پر مصر تھیں۔"

"لیکن یہاں ٹھہرے رہنے کے لیے یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔"

وہ پھر سے اسی مجہول کیفیت میں لوٹ چکا تھا۔ "میں سو رہی ہوں،" میں نے اپنے سے کہا۔ "یہ ایک ڈراونا خواب ہے، اور میں جلد ہی بیدار ہو جاؤں گی۔" لیکن نہیں، اگر کوئی چیز خواب تھی تو وہ ہماری ضرورت سے زیادہ افسردہ سہ پہر تھی، اور اب ہم بیدار ہو چکے تھے۔ جھیل کے کنارے لوئس نے مجھ سے اس طرح گفتگو کی تھی جیسے میں اس سے کبھی جدا نہیں ہونے والی، اور اس نے ایک چھلا بھی میری انگلی میں چڑھا دیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ تین دن میں میں ہمیشہ کے لیے چلی جانے والی تھی -- اور وہ یہ جانتا تھا۔ "وہ اسی بات پر مجھ سے خفا ہے، اور بجا طور پر،" میں نے سوچا۔ "اگر میں ٹھہر نہیں سکتی، تو آئی ہی کیوں؟ اس کا سارا غم و غصہ اس بات پر ہے اور اس کی یہی تلخی ہمیشہ کے واسطے ہماری جدائی کا سبب بنے گی۔" ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کرنے کے واسطے کتنا کم درکار تھا؛ ابھی تھوڑی دیر قبل ہم ہمیشہ کے واسطے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے! میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"ناراض ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

میں نے بےسود اس کی آنکھوں کو ٹٹولا؛ اگر میرے گٹے ٹوٹ جاتے، کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا، تو بھی اس پر ذرا اثر نہیں ہونے والا تھا۔ نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی گریجویشن کے لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئی اور قطار بنا کر کھڑی ہو گئی؛ ایک مریل سی سنولائی

ہوئی لڑکی مائیکروفون کی طرف بڑھی اورخوب بن بن کر گانا شروع کر دیا۔

"میں تو چلی،" میں سخت کسمپرسی کے عالم میں بڑبڑائی۔

لوئس نے جنبش تک نہ کی، اور میں نے شدید بےیقینی سے سوچا، "کیا یہ ممکن ہے کہ سب کچھ ختم شد؟ کیا میں اسے اتنی جلدی ہی کھو بیٹھی ہوں؟ میں نے تھوڑی سی عقلِ سلیم استعمال کرنے کی کوشش کی؛ میں نے اسے کھویا کہاں تھا، کہ پایا ہی کب تھا، اور مجھے شکوے شکایت کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں نے خود کو صرف عاریتاً ہی تو اس کے حوالے کیا تھا۔ اچھا ٹھیک ہے، حرفِ شکایت منہ پر نہ لاؤں گی، پھر بھی مجھے تکلیف تو پہنچ رہی ہے؛ میں نے اپنے تانبے کے چھلّے کو چھو کر دیکھا۔ اس تکلیف سے نجات پانے کا بس ایک ہی ذریعہ تھا؛ ہر چیز تج دوں۔ میں اس کا چھلا لوٹا دوں گی؛ کل صبح جہاز پکڑ کر نیویارک پہنچ جاؤں گی، اور وہ دن محض ایک یاد میں تبدیل ہو جائے گا جسے وقت اول آخر محو کر ہی دے گا۔ چھلا میری انگلی سے پھسلنے لگا اور ایک بار پھر مجھے نیلا آسمان نظر آیا، اور لوئس کی مسکراہٹ؛ وہ میرے بالوں سے پیار کے ساتھ کھیل رہا تھا، مجھے این کہہ کر پکار رہا تھا۔

میں نے اپنا سر اس کے کندھے میں دھنسا دیا۔ "لوئس!"

اس نے اپنا بازو میرے گرد ڈال دیا، اور آنسو میرے گالوں سے ہوتے ہوئے نیچے بہنے لگے۔

"کیا میں نے واقعی تمہارے ساتھ اتنا ذلیل برتاؤ کیا ہے؟"

"تم نے مجھے واقعی ڈرا دیا تھا،" میں نے کہا۔ "میں اتنی خوف زدہ تھی!"

"خوف زدہ؟ پیرس میں جرمنوں سے خوف زدہ تھیں؟"

"نہیں۔"

"اور مجھ سے ہو گئیں؟ مجھے فخر ہے کہ۔۔۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔" اس نے ہولے سے میرے بالوں کو چوم لیا، اس کا ہاتھ میرے بازو کو سہلانے لگا۔ "معلوم ہے، میں تمہارا چھلا واپس کرنے والی تھی؟" میں بڑبڑائی۔

"ہاں، میں دیکھ رہا تھا۔" اس نے گمبھیرتا سے کہا۔ "میں نے اپنے سے

کہا، میں ہمیشہ ہی بنابنایا کھیل بگاڑ دیتا ہوں۔ تاہم کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے اصرار نہیں کیا، لیکن اتنا ضرور پوچھا، "یہاں سے اٹھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

ٹیکسی میں اس نے یکبارگی کہا، "کبھی تمھارے جی میں نہیں آتا کہ سب کو قتل کر دو، اور اپنے کو بھی؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "خاص طور پر اس وقت تو بالکل نہیں جب تمھارے ساتھ ہوں۔"

وہ مسکرا دیا اور قرینے کے ساتھ مجھے اپنے کندھے سے لگا لیا۔ مجھے پھر سے اس کی حرارت مل گئی تھی، اس کا تنفس، لیکن وہ خاموش رہا، اور میں نے سوچا، "مجھے خواہ مخواہ شک نہیں ہوا تھا؛ وہ تناؤ بےوجہ نہیں تھا۔ اس کے خیال میں ہمارا معاشقہ سِرے سے مہمل تھا؛ اور اب بھی اس کا یہی خیال ہے۔"

ہمارے بستر پر جاتے ہی اس نے بتی بجھا دی؛ اور کامل اندھیرے میں مجھ سے ہم جسم ہوا، بھرپور خاموشی کے ساتھ، میرا نام لیے بغیر، مجھے اپنی مسکراہٹ کا نذرانہ پیش کیے بغیر۔ اور پھر، بِنا ایک لفظ کہے، مجھ سے الگ ہو گیا۔ "ہاں،" میں نے پوری دہشت کے ساتھ اپنے سے کہا، "ہاں وہ اس بات پر مجھ سے خفا ہے؛ میں اسے کھو دینے والی ہوں۔"

"لوئس۔" میں نے التجا کی، "کم از کم اتنا ہی کہہ دو کہ تم مجھے پسند کرتے ہو، تھوڑا سا ہی؟"

"پسند؟ لیکن مجھے تو تم سے باقاعدہ محبت ہے،" اس نے آپے سے باہر ہو کر کہا۔ اس نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی اور میں بڑی دیر تک سسکتی رہی، نہ جانتے ہوئے کہ میرا گریہ اس وجہ سے ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے، یا اس وجہ سے کہ میں اس سے محبت کرنے کی اہل نہیں، یا اس وجہ سے کہ ایک دن وہ مجھ سے محبت کرنا ختم کر دے گا۔

"مجھے اس سے صاف صاف بات کرنی ہی ہو گی،" اگلی صبح آنکھ کھلتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا۔ اب جبکہ "محبت" کا لفظ استعمال ہو ہی چکا تھا، میرے لیے لوئس سے یہ وضاحت کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ آخر میں یہ لفظ استعمال کرنے سے کیوں گریز کر رہی ہوں۔ لیکن اس نے مجھے اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ "تم کس قدر گلابی ہو! اور کتنی گرم گرم سی!" وہ بڑبڑایا اور میں ڈھے گئی۔ میری ہمت جواب دے گئی۔ اس کی بانہوں میں گرم اور گلابی ہونے کی شادمانی کے سوا کسی اور شے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ہم شہر کی سیاحت پر نکل پڑے، بانہوں میں بانہیں ڈالے سڑکیں ناپتے پھرے، سڑکیں جن پر بودے سے تیرہ و تاریک گھروں کا حاشیہ لگا ہوا تھا، گھر جن کے سامنے چمکتی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔ ایک علاقے میں سڑک کے دورویہ خندق سی چلی گئی تھی جس پر سطح سے نیچے تعمیر کیے ہوئے گھروں تک لے جانے والے زینے پُلوں کی صورت پھیلے ہوئے تھے؛ مجھے ایسا لگا جیسے کسی پُشتے پر چل رہی ہوں۔ شاہراہِ مِشی گن کے فٹ پاتھوں کے نیچے مجھے وہ شہر ملا جس میں سورج کا گزر نہ تھا، جس میں سارا سارا دن نیون لائٹس جلتی رہتی تھیں۔ ہم نے دریا پر کشتی رانی کی، اور ایک ٹاور کی چھت پر بیٹھ کر مارٹینی پی، جہاں سے ایک غیرمختتم جھیل، اور اتنے ہی ناپیداکنار سبربز کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ لوئس کو اپنے شہر سے عشق تھا، اور اس نے اس کی ہر ہر چیز کا بڑی تفصیل کے ساتھ مجھ سے ذکر کیا: اس کے بےشجر، وسیع گھاس کے میدان، انڈینز، اولین لاگ کیبنیں، سؤروں کی غرّاہٹ سے پُر تنگ گلیاں، وہ مشہورومعروف آتش زدگی کی واردات، پہلی پہلی فلک بوس عمارتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سارے واقعات اس نے بہ چشمِ خود مشاہدہ کیے ہوں۔

"ڈنر کہاں کھانا پسند کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"تم جہاں بھی چاہو۔"

"میں سوچ رہا تھا کیوں نہ گھر ہی پر کھائیں۔ ویسے تمھارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے،" میں نے کہا، "چلو گھر ہی پر کھاتے ہیں۔" لمحہ بھر کے لیے میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا؛ اس نے کہا تھا "گھر ہی پر،" یوں جیسے ہم

میاں بیوی ہوں -- جبکہ ساتھ گزارنے کے لیے ہمارے پاس صرف دو ہی دن باقی تھے۔ "مجھے اس سے بات کرنی ہی ہو گی،" میں نے اپنے سے دہرایا۔ مجھے اس سے کہہ دینا چاہیے کہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس سے محبت کرتی، اور یہ کہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیا وہ سمجھ سکے گا؟ یا الٹا مجھ سے نفرت کرنے لگے گا؟

ہم نے تھوڑا سا ہیم، تھوڑی سی سلامی، کیانٹی شراب کی ایک بوتل، اور ایک رَم کیک خریدا۔ نکڑ پر مڑتے ہی سامنے شلتز کا سرخ روشنی والا اشتہار چمکتا نظر آیا۔ زینے کے نیچے کوڑےکرکٹ کے ڈبوں کے درمیان اس نے بڑی مضبوطی سے مجھے بھینچ لیا اور دیر تک اپنے سے لگائے کھڑا رہا۔ "این! جانتی ہو مجھے تم سے اتنی شدید محبت کیوں ہے؟ اس لیے کہ میں تمھاری خوشی کا باعث ہوں۔" لیکن میرے لبوں کو اپنے منھ کے قریب لاتے ہی، تاکہ اس کی سانس کا تعطّر میرے رگ و پے میں سرایت کر جائے، اس نے یکبارگی مجھے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ "پورچ میں کوئی ہے،" اس نے کہا۔

وہ بڑی تیزی سے میرے آگے آگے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا، اور میں نے اسے بشاشت سے چلاتے ہوے سنا، "مَرِیا! کیسی خوش گوار حیرت ہے! آؤ، اندر چلو۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، "این۔ مریا۔ مریا میری پرانی دوست ہے۔"

"میں تمھیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی---"

"تم بالکل ڈسٹرب نہیں کر رہیں۔"

وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ جوان تھی، ایک ذرا تھوڑی سی بےڈول۔ اگر تھوڑا سا میک اپ کر لیا ہوتا اور کچھ احتیاط سے بال سنوار لیے ہوتے تو یقیناً خاصی حسین لگتی۔ اس کے آستین سے بےنیاز نیلے رنگ کے ہاؤس ڈریس سے دو سفید بازو نکلے ہوے تھے، جن میں سے ایک بڑی بڑی خراشوں کے نشانوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ ہمسایوں کی طرح بےتکلف ملنے چلی آئی ہو گی، اسی لیے شاید سلیقے سے کپڑے وغیرہ پہن کر آنے کی زحمت نہیں کی۔ "پرانی دوست۔" اس کا ٹھیک ٹھیک کیا مطلب تھا؟

وہ بیٹھ گئی، اور کسی قدر خرخراتی آواز میں بولی، "لوئس، تم سے

بات کیے بغیر چارہ نہ تھا۔"

ایک کڑواہٹ میرے منھ میں پھیل گئی۔ "لوئس۔" اس نے اس کا نام اس طرح لیا جیسے اس سے بےحد مانوس ہو، اور جب لوئس کیانٹی کی بوتل کا کاگ اڑانے میں مصروف تھا، وہ اسے ایک منڈلاتی ہوئی دھیمی چاہت سے دیکھے جا رہی تھی۔

"دیر سے انتظار کر رہی تھیں؟" لوئس نے پوچھا

"یہی کوئی دو تین گھنٹے سے،" اس نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ ہو۔ "نچلی منزل والے بڑے پیارے لوگ ہیں؛ انھوں نے مجھے کافی پلانے کے لیے اندر بلا لیا تھا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ وہ تمھارا کتنا لحاظ کرتے ہیں۔" وہ کیانٹی کا پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی گئی۔ "تم سے چند بڑی اہم باتیں کرنی ہیں۔" اس نے سرتاپا میرا جائزہ لے ڈالا۔ "نِجی باتیں۔"

"تم این کی موجودگی میں کر سکتی ہو،" لوئس نے کہا، پھر یہ اضافہ اور کر دیا، "این فرانسیسی ہے؛ پیرس میں رہتی ہے۔"

"پیرس؟" مریا نے شانے اچکائے۔ "تھوڑی سی شراب اور دو۔" لوئس نے اس کا گلاس بھر دیا، جسے اس نے بڑے ندیدےپن سے خالی کر دیا۔ "تمھیں میری مدد کرنی ہی ہو گی،" اس نے کہا۔ "صرف تمھی ہو۔۔۔"

"کوشش کروں گا۔"

وہ ہچکچائی؛ پھر فیصلہ کر لیا۔ "اچھا۔ میں تمھیں سارا واقعہ بتاتی ہوں۔"

میں نے تھوڑی سی شراب انڈیلی اور تردّد سے سوچا، "کیا یہ ساری رات یہیں پڑی رہے گی؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اور اسٹوو سے ٹیک لگا کر ایک پوری رام کہانی سنا ڈالی، جس کا تعلق شادی، طلاق، اور ایسے کریئر (career) سے تھا جو تکمیل پانے سے رہ گیا تھا۔ "تمھیں کامیابی نصیب ہوئی،" وہ بڑے جارحانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ "لیکن ایک عورت ذات کے لیے کامیاب ہونا اتنا آسان نہیں۔ مجھے وہ کتاب لکھنی ہی ہے۔ لیکن جہاں ہوں وہاں رہ کر لکھ نہیں سکتی۔" اب میں بہ مشکل ہی اس کی بات سن رہی تھی۔ میں برہمی سے سوچ رہی تھی کہ آخر لوئس اس سے جان چھڑانے کا کوئی بہانہ کیوں نہیں نکال لیتا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت

ہے، اور اسے یہ بھی بہ خوبی معلوم تھا کہ ہمارے پاس بس گنی چنی ساعتیں ہی رہ گئیں تھیں۔ تاہم۔۔۔

لیکن اس نے بڑی نرمی سے پوچھا، "اور تمہارے گھر والے؟"

"یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ میرے گھر والے؟" ایک بڑی ہیجان آمیز حرکت سے مریا نے میز پر پھیلے ہوے اوراق چن لیے، انھیں مروڑا اور بڑے زور سے کوڑے کی بالٹی میں پھینک دیا۔

"مجھے بےترتیبی سے نفرت ہے؟" اس نے لوئس پر اپنی آنکھیں جڑ دیں اور بات جاری رکھی، "نہیں، صرف تمھی ہو جس پر تکیہ کر سکتی ہوں۔"

وہ خجل سا اٹھ کھڑا ہوا۔ "بھوک لگی ہے؟ ہم بس کھانا کھانے ہی والے تھے۔"

"شکریہ،" اس نے کہا۔ "میں نے پنیر کے سینڈوچ کھا لیے ہیں۔۔۔ امریکی پنیر کے،" اس نے غیرمبہم سی جارحانہ آواز میں زور دے کر کہا۔

"اور آج رات سوؤ گی کہاں؟" اس نے پوچھا۔

وہ بری طرح ہنس پڑی۔ "سوؤں گی کہاں؛ دس پیالیاں کافی چڑھائے بیٹھی ہوں۔"

"اچھا تو رات کہاں گزارو گی؟"

"لیکن تمھی نے تو یہاں بلایا تھا، بلایا تھا نا؟" اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ ڈالا۔ "ظاہر ہے، اگر تم دوسری عورتوں کو گھر میں گھسائے رکھنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہو تو میں یہاں رات گزارنے پر بالکل تیار نہیں ہو سکتی۔"

"بدقسمتی سے، یہاں ایک عورت پہلے سے موجود ہے،" لوئس نے کہا۔

"تو اسے ہاتھ پکڑ کر چلتا کرو؟" مریا بولی۔

"اتنا آسان نہیں،" لوئس خوش دلی سے بولا۔

پہلے میرا جی ہنسنے کو چاہا۔ جس لمحے مریا نے منھ کھولا تھا، مجھے صاف معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ یہ پاگل خانے سے رسی تڑا کر آئی ہے۔ پھر اپنے اندھے پن پر مجھے خوف آنے لگا۔ میں کس قدر غیرمحفوظ رہی ہوں گی کہ اس بےچاری پاگل لونڈیا میں مجھے اپنا حریف نظر آنے لگا! صرف دو ہی دنوں میں مَیں یہاں سے رخصت ہو رہی ہوں گی، لوئس کو بھوکی عورتوں

کے ایک غولِ بیابانی کے سپرد کر کے، جو اس سے محبت کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوں گی- یہ خیال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا-

"میں اس سے دس سال بعد ملی ہوں،" مریا نے بڑے واجب تعمیل انداز میں مجھ سے کہا- "مجھے صرف آج کی رات اس کے ساتھ سو لینے دو، پھر تم ساری زندگی اس کے ساتھ سوتی رہنا- ٹھیک ہے، ہے نا؟"

جب میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو وہ لوئس کی طرف متوجہ ہو گئی، "اگر میں آج یہاں سے چلی گئی، تو پھر کبھی نہیں آنے والی- اگر میں یہاں سے گئی، تو کل ہی کسی دوسرے سے شادی کر لوں گی-"

"لیکن یہ این کا گھر ہے،" لوئس نے کہا- "ہم شادی شدہ ہیں-"

مریا کا منھ فق ہو گیا- "معاف کرنا، مجھے نہیں معلوم تھا-" اس نے کیانٹی کی بوتل اٹھائی اور بڑی حرص سے بوتل ہی سے پینے لگی- "مجھے ایک ریزر دو-"

ہم نے آنکھوں آنکھوں میں بڑی پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر لوئس نے کہا، "میرے پاس تو کوئی ہے نہیں-"

"چلو چلو، جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" وہ کھڑی ہوئی اور چل کر سنک تک پہنچی- "اس بلیڈ سے کام چل جائے گا- کر لوں استعمال؟" اس نے بیٹھتے ہوئے بڑے استہزائی انداز میں مجھ سے پوچھا- اس نے اپنی رانیں اچھی طرح سے پھیلا لیں، اور بڑے ہیجانی ارتکاز سے اپنی ٹانگیں مونڈنے لگی- "اب یہ بہتر لگ رہی ہیں، لاکھ درجہ بہتر؟" وہ دوبارہ اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پھر پہلے ایک بغل کے بال مونڈے، پھر دوسری کے- "اس سے بہت فرق پڑتا ہے،" اس نے اعلان کیا، اپنے سراپے کو بڑی پُرشہوت مسکراہٹ کے ساتھ آئینے کے سامنے تان کر- "ہاں، بالکل! میں کل اس ڈاکٹر سے شادی کر لوں گی- مجھے ایک نِگر کے ساتھ شادی کرنے کا بالکل حق ہے، اور کیوں نہ ہو، میں خود بھی تو ایک نِگر کی طرح محنت کرتی ہوں-"

"مریا، دیر ہو رہی ہے،" لوئس نے کہا- "میں تمھارے لیے ہوٹل میں کمرے کا بندوبست کرتا ہوں- تم وہاں سکون سے سو سکوگی-"

"مجھے نہیں سونا وونا-" اس نے لوئس کو غصیلی نظروں سے دیکھا- "تم نے مجھے اندر بلانے پر کیوں اصرار کیا تھا؟ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ

لوگ میری سُبکی کریں۔" اس نے مکا اٹھایا اور لوئس کے چہرے کے کوئی انچ بھر قریب لے آئی۔ "میری پوری زندگی میں اس سے زیادہ ذلیل حرکت کسی نے میرے ساتھ نہیں کی۔ تمھاری خاطر مجھے کیا کیا نہیں برداشت کرنا پڑا؟" اس نے اپنے بازو پر پھیلی خراشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا۔

"چلو اٹھو، دیر ہو رہی ہے،" لوئس نے پرسکون آواز میں دہرایا۔

مریا کی نگاہ سِنک پر جا پڑی۔ "اچھا ٹھیک ہے، جاتی ہوں۔ لیکن پہلے تھوڑا سا پانی تو گرم کرو تاکہ میں برتن دھو ڈالوں۔ میں گندگی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اسٹوو پر گرم پانی موجود ہے،" لوئس نے سپر ڈالتے ہوے کہا۔

اس نے کیتلی اٹھائی اور بڑی خاموش عجلت کے ساتھ برتن دھونے لگی۔ جب فارغ ہوئی تو گیلے ہاتھ ہاؤس ڈریس سے پونچھ کر خشک کیے۔

"اچھا تو اب تمھیں تمھاری بیوی کے حوالے کر کے چلتی ہوں۔"

"میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں،" لوئس نے کہا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھی؛ لوئس نے ہلکا سا اشارہ کیا، جیسے کہہ رہا ہو کہ "بس ابھی واپس آیا۔" میں نے میز پر برتن لگائے اور ایک سگریٹ سلگایا۔ دوسرا موقع ملنے کا اب اتفاق نہیں ہو گا۔ لوئس تھوڑی دیر میں لوٹ آئے گا؛ مجھے اس سے بات کرنی ہی ہو گی۔ لیکن وہ الفاظ جو میں اپنے دماغ میں صبح سے الٹ پلٹ کرتی رہی تھی، اچانک ان کے کوئی معنی نہیں رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ سب بےحد حقیقی تھا: رابرٹ، نےڈیِن، میرا کام دھام، پیرس۔ صرف ایک دن ان کو غیرحقیقی بنا دینے کے لیے ناکافی تھا۔

لوئس دوبارہ کچن میں نمودار ہوا اور بڑی احتیاط سے پیچھے دروازہ مقفل کر دیا۔ "اسے ٹیکسی میں سوار کرا آیا ہوں۔ مجھ سے کہنے لگی، یہی بہتر ہے کہ واپس لوٹ جاؤں اور انھی پاگلوں کے ساتھ سو رہوں۔ لگتا ہے اسی سے پھر وہاں سے فرار ہوئی تھی اور سیدھی یہیں چلی آئی تھی۔"

"شروع شروع میں مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں، میں دیکھ رہا تھا۔ وہ چار سال سے اسائلم میں ہے۔ پچھلے سال اس نے مجھے خط لکھ کر میری کتاب کی ایک جِلد کی فرمائش کی۔ میں نے ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ بھیج دی۔ میں اِسے بہ مشکل جانتا ہوں۔" اس

نے مسکراتے ہوئے اپنے اردگرد پر نظر ڈالی۔ "جب سے اس علاقے میں رہنا شروع کیا ہے، عجیب واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ یہ جگہ ہے ہی ایسی۔ یہاں سب کھنچے چلے آتے ہیں؛ بلّیاں، پاگل، منشیات کے عادی، اور---"۔ اس نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا، "سادہ دل۔"

اس نے گراموفون پر چند ریکارڈ چڑھا دیے، واپس آیا، اور میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی سی کیانٹی بچ رہی تھی، جو میں نے اس کے اور اپنے گلاس میں انڈیل دی۔ ہم ایک دوسرے سے لگے بیٹھے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور گراموفون پر آئرش لوک گیت بجتا رہا۔ میکسکن کمبل کے نیچے بستر ہمارا منتظر تھا۔ یہ روزمرہ کی معمولی شاموں جیسی ایک شام تھی، جس کے بعد اسی جیسی دوسری ہزاروں شامیں آنے والی تھیں۔ لوئس نے اس خیال کو جو میرے ذہن میں تھا گویائی دے دی۔ "تم تقریباً یہ یقین کر سکتی ہو کہ میں مریا سے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔" اچانک اس نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا۔ "اور کیا پتا؟"

مجھے پتا تھا۔ میں نے اپنا سر اس سے دور کر لیا؛ اب اور زیادہ پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ "لوئس،" میں بڑبڑائی، "میں نے تمھیں اپنے بارے میں جتنا بتانا چاہیے تھا، نہیں بتایا ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جن کی وضاحت تم سے کرنی ضروری ہے---"

"اچھا؟" اس کی آنکھوں میں ہراس کی کیفیت تھی، اور میں نے سوچا، "ختم شد؟" میں نے ایک آخری بار اسٹوو کی طرف نظر ڈالی، دیواروں، کھڑکی اور اس کمرے کی طرف جس میں جلد ہی میری حیثیت ایک ناخواندہ مہمان سے زیادہ نہیں رہنے والی تھی۔ اور پھر، اندھادھند، لفظ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے میرے منھ سے نکلنے لگے اور میں بڑی تیزی سے پورے پورے جملے ادا کرنے لگی۔ ایک دن، پہاڑوں میں، مَیں ایک نالے میں چاروں شانے چت گر پڑی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ میری موت آ گئی ہے اور مجھے لاتعلقی کے سوا کچھ نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ تسلیم و رضا کی اسی کیفیت سے آج، باردگر، سامنا تھا۔ فرق تھا تو اتنا کہ میرا جی چاہا کہ اے کاش میں اپنی آنکھیں بند کر سکتی!

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تمھاری نظروں میں تمھاری شادی کی ابھی تک

اتنی اہمیت ہے،" لوئس نے کہا۔
"بالکل ہے۔"
وہ ایک طویل لمحے کے لیے خاموش رہا۔
"سمجھ میں آ رہی ہے میری بات؟" میں بڑبڑائی۔
اس نے اپنا بازو میرے کندھوں کے گرد ڈال دیا۔ "اس اعتراف کے بعد تم میری نظر میں پہلے سے زیادہ بیش قیمت ہو گئی ہو۔ تمھاری اہمیت میرے لیے ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔" میں نے اپنا رخسار اس کے رخسار سے رگڑا اور وہ تمام الفاظ جن کو میں اس کے لیے استعمال کرنے سے مسلسل انکار کرتی رہی تھی، یکایک میرے دل میں امڈ آئے۔
"اب تمھیں سو رہنا چاہیے۔" وہ بولا۔ "میں کچھ صفائی وغیرہ کروں گا، پھر بستر پر تمھارے پاس آ جاؤں گا۔"
دیر تک برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی رہی، اور پھر مجھے کچھ سنائی نہیں دیا؛ میں سو گئی۔ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، تو وہ میرے پہلو میں محوِخواب تھا۔ اس نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا؟ اس نے کیا سوچا؟ وہ کل کیا سوچے گا؟ اور جب میں یہاں سے رخصت ہو چکی ہوں گی اس وقت؟ میں پوری خاموشی کے ساتھ بستر سے نکلی، کچن کا دروازہ کھولا، اور پورچ کی ریلنگ کے سہارے جھک کر کھڑی ہو گئی۔ میرے نیچے، وہ سیاہ درخت کانپ رہا تھا؛ زمین اور آسمان کے درمیان، گیس ٹینک کے اوپر، رات کے اندھیرے میں، قمقموں کا ایک تاج سا دمک رہا تھا۔ سردی تھی، اور میں کپکپانے لگی۔
نہیں، میں یہاں سے رخصت نہیں ہونا چاہتی۔ پرسوں تو نہیں، اتنی جلدی ہرگز نہیں۔ میں پیرس تار دے دوں گی؛ دس دن اور ٹھہر سکتی ہوں، یا دو ہفتے--- ٹھیک ہے، ٹھہر سکتی ہوں--- لیکن پھر؟ جلد یا بدیر، مجھے جانا ہی پڑے گا۔ مجھے یہاں سے فوراً چلا جانا چاہیے، اس کی دلیل کے طور پر اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے ابھی سے اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ تاہم یہ ہنوز بحری سفر کے دوران کشتی پر کیے جانے والے آنی جانی معاشقے سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن اگر میں ٹھہر گئی، تو یہ واقعی محبت میں، ایک تکلیف دہ محبت میں بدل جائے گا، اور تب صحیح معنوں میں

میرے کرب کی ابتدا ہو گی اور میں تکلیف نہیں اٹھانا چاہتی تھی؛ میں نے پولا (Paula) کو تکلیف اٹھاتے ہوئے بہت قریب سے دیکھا تھا؛ میں اذیت میں مبتلا بہت سی عورتوں کو، جنھیں میں کوئی افاقہ نہیں پہنچا سکی تھی، (تحلیل نفسی کے واسطے) اپنی کاؤچ پر پسروا چکی تھی۔ "اگر میں اسی وقت چلی جاؤں، تو بھول جانا ممکن ہو گا۔" میں نے سوچا۔ "بلکہ بھول جانے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ آدمی بھول جاتا ہے؛ سیدھی سی بات ہے۔ آدمی ہر چیز بھول جاتا ہے؛ جلد ہی بھول جاتا ہے؛ چار دن کی مدت کو بھول جانا آسان ہے۔" میں نے لوئس کا اس طرح تصور کیا جیسے کوئی فراموش کردہ شخص ہو؛ وہ گھر میں چل پھر رہا تھا اور مجھے بھول چکا تھا۔ ہاں، وہ مجھے بھلا دے گا۔ آج یہ "میرا" کمرا، "میرا" پورچ، اور "میرا" بستر ہے؛ ایک دل ہے جو "مجھ" سے لبریز ہے--- اور کل یوں لگے گا جیسے میرا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ میں نے دروازہ بند کر دیا، اور جذبے کی شدت سے سوچا، "لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہ ہو گا؛ اور میں اسے اپنی تقصیر کی وجہ سے نہیں کھو دوں گی۔"

"نیند نہیں آ رہی؟" لوئس نے پوچھا۔

"نہیں،" میں پلنگ کی پٹی پر، اس کی حرارت کے قریب، بیٹھ گئی۔ "لوئس، اگر ایک دو ہفتے اور ٹھہر جاؤں تو یہ ممکن ہو گا؟"

"میرا خیال تھا کہ تمھارا پیرس میں انتظار ہو رہا ہے،" اس نے کہا۔

"میں پیرس تار بھیج سکتی ہوں۔ مجھے یہاں کچھ دیر اور رکھ سکتے ہو؟"

"تمھیں رکھ سکتا ہوں؟ میں تو ساری زندگی تمھیں رکھ سکتا ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔

اس نے یہ الفاظ اتنی شدت سے مجھے دے مارے تھے کہ میں سیدھی اس کی بانہوں میں آ گری۔ میں نے اس کی آنکھوں، اس کے لبوں کا بوسہ لے ڈالا؛ اور پھر میرا منھ نیچے اس کے سینے کے سہارے سہارے چل نکلا۔ اس کی مخصوص مردانہ مہک، اس کی آنچ سے میرا سر چکرانے لگا، جیسے کوئی نشہ آور مشروب پی لیا ہو، مجھے ایسا لگا جیسے میری زندگی مجھ سے رخصت ہو رہی ہو، میری پرانی زندگی، اپنی جملہ پریشانیوں، واماندگیوں

اور پیشِ پا افتادہ یادوں کے ساتھ۔ لوئس کی بانہوں میں ایک بالکل نئی عورت ہمک رہی تھی۔ میں کراہ دی، اور صرف لذت ہی سے نہیں، بلکہ مسرت سے بھی۔ پہلے میری نظروں میں لذت کی بڑی معمولی سی وقعت ہوا کرتی تھی، لیکن یہ آج پتا چل رہا تھا کہ جنسی ملاپ کی اثرانگیزی اتنے شدید طور پر بھی حاوی ہو سکتی ہے۔ ماضی، مستقبل، غرض ہر وہ چیز جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر رہی تھی، ہمارے بستر کے دامن میں آ کر فنا ہو گئی۔ اب ہمارے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ کیسی شاندار فتح مندی تھی! لوئس، پورے کا پورا، میری آغوش میں تھا، اور میں اس کی۔ ہمیں کسی اور چیز کی خواہش نہ تھی۔ سب کچھ مہیا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ہم ایک ساتھ چلا دیے، "کیسی زبردست خوشی ہے!" اور جب لوئس نے کہا، "مجھے تم سے محبت ہے،" تو میں نے یہ الفاظ اس کے ساتھ ساتھ ادا کیے۔

میں نے شکاگو میں دو ہفتے گزارے۔ یہ دو ہفتے ہم نے کسی فردا کے بغیر اور بِنا ایک دوسرے سے کوئی استفسار کیے گزارے۔ ہم نے اپنی ماضی سے واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ایک دوسرے کو سنائے۔ زیادہ تر باتیں لوئس ہی نے کیں؛ وہ بہت تیزی سے بول رہا تھا، خفیف سی بےچینی کے ساتھ، جیسے ایک عمر کی خاموشی کی تلافی کر رہا ہو۔ جس ڈھب سے الفاظ ایک کے بعد ایک بہ سرعت اس کے منھ سے نکل رہے تھے، یہ مجھے پسند آیا؛ وہ جو کہہ رہا تھا، مجھے اچھا لگ رہا تھا، اور جس طرح کہہ رہا تھا وہ بھی۔ میں مسلسل اس سے محبت کرنے کے نت نئے اسباب دریافت کرنے میں لگی ہوئی تھی، شاید اس لیے کہ اس میں ہر نئی دریافت خود میری محبت کے واسطے ایک نیا بہانہ ثابت ہو رہی تھی۔ موسم پُرلطف تھا، اور ہم نے اچھا خاصا وقت شہر کی مٹرگشت میں گزارا۔ جب تھک جاتے تو کمرے لوٹ آتے، عموماً اس گھڑی جب درخت کا سایہ زرد جھلملی سے رخصت ہو رہا ہوتا۔ لوئس گراموفون پر ریکارڈوں کی تھپی چڑھا دیتا اور اپنا سفید باتھ روب پہن لیتا؛ اور میں، اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس، خاموشی سے اس کی آغوش میں پڑی رہتی، اس لمحے کے انتظار میں جب خواہش ہمیں مغلوب کر دے۔ میری عادت ہے کہ ان جذبات کے بارے میں جو میں دوسروں میں ابھارتی

ہوں، ہمیشہ بڑے شک و شبے کے ساتھ اپنے سے استفسار کرتی ہوں۔ تاہم اس موقعے پر میں نے ایک مرتبہ بھی حیرت سے یہ نہ سوچا کہ مجھ میں یہ کون ہے جس سے لوئس محبت کر رہا ہے۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ عورت مَیں ہی ہوں۔ اسے نہ میرے ملک کے بارے میں معلوم تھا، نہ میری زبان، نہ میرے دوست احباب، اور نہ میری فکروں کے بارے میں؛ وہ اگر کچھ جانتا تھا تو یہ صرف میری آواز تھی، میری آنکھیں اور میری جلد۔ اس جلد، اس آواز اور ان آنکھوں کے علاوہ میری کوئی اور حقیقت نہ تھی۔

میری روانگی سے دو دن پہلے ہم نے رات کا کھانا اسی پرانے جرمن ریستوران میں کھایا، پھر وہاں سے جھیل کے کنارے گئے۔ سرمئی، دودھیا آسمان کے نیچے پانی تاریک لگ رہا تھا؛ گرمی تھی۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی، نیم عریاں اور پانی سے شرابور، ایک کیمپ فائر کے گرد اپنے جسم خشک کر رہی تھی۔ اس سے پرے، مچھیرے اپنی ڈوریں ڈال رہے تھے؛ ان کے برابر، سیمنٹ کے پشتے پر، سلیپنگ بیگز اور تھرموس بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ پشتہ ویران ہونا شروع ہو گیا۔ ہم خاموش تھے۔ جھیل سہج سے ہمارے پیروں میں لہریں مار رہی تھی؛ یہ آج بھی اتنی ہی وحشی اور نافرمان تھی جتنی اس پرانے وقت میں جب امریکی انڈینز اس کے دلدلی کناروں میں خیمہ زن ہوتے ہوں گے، یا بلکہ جب ابھی انڈینز وجود ہی میں نہ آئے ہوں گے۔ بائیں طرف، سر کے اوپر، ہمیں شہر کا شوروشغب سنائی دے رہا تھا؛ کاروں کی ہیڈلائٹس اپنی شعاعوں سے سڑکوں کو جھاڑپونچھ رہی تھیں، اور طویل قامت، جگمگاتی عمارتیں آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھیں۔ زمین بےحدوحساب قدیم لگ رہی تھی، اور سراسر نوخیز۔

"کتنی حسین رات ہے!" میں نے کہا۔

"ہاں، حسین رات ہے،" لوئس نے دہرایا۔ اس نے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں کچھ دیر بیٹھنا چاہتی ہو؟"

"اگر تم چاہو۔"

"میں ایسی عورت پر فدا ہوتا ہوں جو ہر بات کا جواب اس طرح دے: اگر تم چاہو!" لوئس نے بشاشت سے کہا۔ وہ میرے برابر بیٹھ گیا اور بازو

میرے گرد ڈال دیا۔ "عجیب بات ہے کہ ہماری خوب نبھ رہی ہے،" اس نے محبت سے کہا۔ "میری کبھی کسی کے ساتھ نہیں نبھی۔"

"یقیناً اس میں قصور دوسروں ہی کا ہو گا،" میں نے کہا۔

"نہیں، میرا ہے۔ میرے ساتھ گزارا آسان نہیں۔"

"میرے خیال میں تو آسان ہے۔"

"میری پیاری گلواز! تم بہت زیادہ مطالبات نہیں کرتیں۔"

میں نے لوئس کے سینے پر سر رکھ دیا اور اس کی دھڑکن سننے لگی۔ میں اس سے زیادہ کیا چاہ سکتی تھی؟ میرے رخسار کے نیچے وہ نہایت ہی جیوٹ اور صابر دل دھڑک رہا تھا، اور میرے گرد وہ سرمئی موتیوں جیسی رات تھی -- رات جو صرف میرے ہی لیے تخلیق ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اسے بسر کرنا میرے مقدر میں ہی نہ ہوتا--- یہ تصور تک ناممکن تھا۔ "تاہم،" میں نے اپنے سے کہا، "اگر فلپ نیویارک آ جاتا، تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔" مجھے فلپ سے کبھی محبت نہیں رہی تھی، کم از کم اس کا یقین مجھے ضرور تھا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ لوئس کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا؛ ہماری محبت سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔ یہ خیال اتنا ہی مضطرب کر دینے والا تھا جتنا یہ خیال کہ آپ پیدا ہی نہ ہوتے، یا ہوتے تو کسی اور کی جون میں۔

"آہ یہ خیال کہ اگر میں تمھیں فون ہی نہ کرتی!" میں بڑبڑائی۔ "یا تم جواب ہی نہ دیتے۔"

"اوہ!" لوئس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم سے دوبارہ ضرور ملاقات ہو گی۔"

اس کی آواز اتنی پُریقین تھی کہ میں ہکابکا رہ گئی۔ میں نے اس کے سینے پر ہونٹ ٹھیک اس جگہ رکھ دیے جہاں اس کا دل دھڑک رہا تھا، اور اپنے سے عہد کیا، "وہ اس ملاقات پر کبھی نہیں پچھتائے گا۔" دو دن میں مَیں چلی جانے والی تھی؛ مستقبل پھر سے بڑا حقیقی نظر آنے لگا تھا۔ تاہم ہم اس سے اپنے لیے مسرت نچوڑ کر نکال ہی لیں گے۔

میں نے سر اٹھایا۔ "لوئس، اگر تم چاہو تو آئندہ بہار میں دو تین ماہ کے لیے یہاں واپس آ جاؤں گی۔"

"تم جب بھی واپس آؤ گی، بہار ہی ہو گی،" لوئس بولا۔

دیر تک یوں ہی ایک دوسرے کی بانہوں میں جکڑے ہوئے ہم ستاروں کو دیکھتے رہے۔ ناگہاں ایک ستارہ ٹوٹا اور تیزی سے آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تیر گیا، اور میں نے کہا، "کچھ مانگنا ہے تو مانگ لو؟"

"میں پہلے ہی سے مانگ چکا ہوں۔"

یکایک مجھے حلق میں جکڑن سی محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے کیا مانگا ہو گا، اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اسے ملنے والا نہیں۔ وہاں، پیرس میں، میری زندگی میری منتظر تھی؛ وہ زندگی جسے میں بیس سال سے تعمیر کرتی رہی تھی؛ میں اسے خطرے میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں آتی بہار میں لوٹ آؤں گی--- لیکن بارِدگر اسے چھوڑ کر چلے جانے کے لیے۔

اگلا دن میں نے شاپنگ کرنے میں گزارا۔ مجھے پیرس یاد آیا، وہ اس کی دکانوں کی افسردہ اور بے رونق کھڑکیاں؛ وہ اس کی بےسلیقہ اور پھوہڑ عورتیں، اور میں بلا سوچے سمجھے ہر یاد آنے والے کے واسطے تحفے خریدتی گئی۔ ہم نے رات کا کھانا باہر ہی کھایا، اور جب میں لوئس کا بازو تھامے چوبی زینے پر چڑھ رہی تھی تو مجھے خیال آیا، "یہ آخری بار ہے۔" گیس ٹینک کے یاقوت زمین و آسمان کے درمیان آخری بار چمک رہے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خونی ابھی ابھی کسی عورت کو قتل کر کے اور اس کی الماریوں کو تہ و بالا کر کے گیا ہو۔ میرے دونوں سوٹ کیس کھلے پڑے تھے، اور چاروں طرف ہر چیز پر، بستر، کرسیوں، اور فرش پر میرے نائلون کے زیریں لباس، اسٹاکنگز، سنگھار کی اشیا، اَن سِلے کپڑے، جوتے، گلوبند، بکھرے پڑے تھے۔ ایک مہک بسی ہوئی تھی، محبت کی، موت کی، تباہی کی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کمرہ کوئی جنازہ گاہ لگ رہا تھا، اور وہ تمام چیزیں کسی مردہ عورت کی باقیات تھیں، وہ تبرکات جنھیں لے کر وہ دارالبقا کی طرف سفر کرنے والی تھی۔ میں اپنی جگہ گڑی کھڑی رہی۔ لوئس سنگھارمیز کے پاس گیا، دراز کھولی، اور ایک ارغوانی رنگ کا ڈبا نکالا۔ اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ خاصا بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"یہ تمھارے لیے لایا تھا،" وہ بولا۔

پرت دار کاغذ کے نیچے ایک بہت بڑا سفید پھول رکھا تھا جس سے بڑی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے پھول اٹھالیا، اپنے منھ سے لگا کر بھینچا اور روتے ہوے بستر پر جا گری۔

"یہ کھانے کے لیے نہیں ہے،" لوئس نے کہا۔ "کیا فرانس میں پھول بھی کھائے جاتے ہیں؟"

ہاں، کوئی مر چکا تھا؛ ایک مسرور عورت، تمام گلابی اور گرم گرم، جو ہر صبح مسکراتی ہوئی بیدار ہوتی تھی۔ میں نے پھول کو دانتوں سے کاٹا؛ میں اس کی مہک میں تحلیل ہو جانا چاہتی تھی، پوری پوری طرح، اور فی الواقع مر جانا چاہتی تھی۔ لیکن میں زندہ ہی سو گئی، اور صبح کی اولین ساعتوں میں لوئس مجھے لے کر نکڑ پر پہنچا۔ ہم نے اسی مقام پر الوداع کہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اشارے سے ٹیکسی بلائی، میں اندر داخل ہوئی، دھڑ سے دروازہ بند ہوا، ٹیکسی نکڑ سے ہو کر مڑی -- اور لوئس غائب شد۔

"آپ کے خاوند تھے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔

"بڑے اداس لگ رہے تھے۔"

"وہ میرے خاوند نہیں تھے،" میں نے کہا۔

وہ اداس تھا۔ خود میں بھی تھی۔ لیکن یہ ایک جیسی اداسی نہ تھی؛ لوئس خالی کمرے میں تنہا لوٹ گیا۔ میں چڑھ کر جہاز میں تنہا داخل ہوئی۔

۱۔ Gauloise؛ (صیغہ مونث) یعنی؛ "میری پیاری فرانسیسی عورت!" رومن قبضے اور تسلط سے پہلے کا قدیم فرانس Le Gaule کہلاتا تھا۔

انتخاب

ژاں ژینے

انتخاب کے گوشے میں اِس بار آپ فرانسیسی زبان کے معروف ادیب ژاں ژینے (Jean Genet) کے کھیل The Maids کا ترجمہ ملاحظہ کریں گے۔ ژینے، جنھیں سارتر نے ولی کے درجے پر فائز کر کے سینٹ ژینے کا لقب دیا، ادب کی شائستہ اور نستعلیق روایات میں اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی انفرادی زندگی جُرم پیشگی، ہم جنس پرستی، ہر قسم کی مروّجہ اخلاقیات سے بےنیازی اور اس کے نتیجے میں طویل قیدوبند سے عبارت رہی بلکہ ان کی ادبی زندگی بھی روایتی حدبندیوں سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ سارتر کے الفاظ میں، "آپ ژینے میں قدرت کی عطا اور صلاحیت کی شان و شوکت نہ دیکھیں گے جس کا ڈھنڈورا پیٹنا اعلیٰ ذہن رکھنے والوں کی عادت ہے۔ ادب کے میدان میں قدم رکھنے والے تربیت یافتہ نوجوانوں کو لکھنے کا ہُنر سب سے پہلے ابلاغ کا ایک ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ژینے نے لکھنا اپنی تنہائی پر اصرار کرنے، خودمکتفی ہونے کی غرض سے شروع کیا، اور رفتہ رفتہ اس عمل، اور اس کے مسائل، کے زیرِاثر پڑھنے والوں کی تلاش تک پہنچا۔ الفاظ کی خوبیوں -- اور خامیوں -- کے نتیجے میں اس تنہائی پسند نے خود کو ادیب کی صورت میں ڈھالا۔ لیکن اس کی تحریروں پر ہمیشہ ان کی اصل کا رنگ قائم رہے گا اور ان کا مطلوبہ ابلاغ بےحد منفرد قسم کا ہو گا۔"

ژینے کو بنیادی طور پر ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، لیکن انھوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں، زیرِنظر کھیل کے علاوہ، Balcony اور The Blacks شامل ہیں۔

The Maids ایک یک بابی کھیل ہے جس کے مرکزی کردار کلیئر (Claire) اور سولانژ (Solange) نام کی دو گھریلو خادمائیں ہیں۔ کھیل کا تمام عمل مادام (مالکن) کی خواب گاہ میں پیش آتا ہے جو گویا خادماؤں کی ناکام آرزوؤں اور انتقامی تخیّل کا میدانِ عمل ہے۔ اس کے ایک جانب باورچی خانہ اور خادماؤں کے رہنے کی کوٹھری ہے جہاں وہ اپنے شب و روز ذلّت اور غلاظت میں گزارنے پر مجبور ہیں۔ دوسری جانب دریچے سے اس دنیا کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ان کی رسائی سے قطعی باہر ہے۔ منٹو کی سوگندھی کی طرح خادمائیں اپنی ہتک کا بدلہ صرف اپنےآپ سے لینے پر قادر ہیں۔ ان کا شکست خوردہ تخیّل انھیں انتقام کے نت نئے راستے سُجھاتا ہے لیکن ہر راستا خود اُنھیں کی تباہی پر ختم ہوتا ہے۔ وہ باری باریِ مادام کا بھروپ بھر کر اپنی متواتر تحقیر کے بوجھ سے رہا ہونا چاہتی ہیں مگر اس کوشش میں اپنے باہمی تعلّق کو مجروح کر بیٹھتی ہیں۔

اُفتادگانِ خاک کی اس دنیا کو ژینے نے جس طرح پیش کیا ہے اس نے اس کھیل کو ایک مکمل اور کامیاب تحریر بنا دیا ہے۔ کرداروں کی، حقیقت سے قدرے عدم مطابقت کے باعث -- جو ژینے کے دانستہ طریقِ کار کا حصّہ ہے -- ان کے طنز کا اثر اَور گھرا ہو گیا ہے اور پڑھنے والے -- یا دیکھنے والے -- کا تخیّل اسے تین دیواروں والی اس دنیا سے باہر لے جا کر معنی کے نئے جہان دریافت کرنے پر اکساتا ہے۔

ژاں ژینے

(فرانسیسی)

انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سیّد

خادمائیں

(مادام کی خواب گاہ۔ لوئی پانزدہم فرنیچر۔ عقب میں ایک کھڑکی جس سے مقابل کے مکان کا بیرونی حصہ نظر آ رہا ہے۔ داہنے ہاتھ کی طرف ایک پلنگ۔ بائیں کو دروازے اور ایک ڈریسنگ ٹیبل۔ کثیر تعداد میں پھول۔ شام کا وقت۔
کلیئر زیرجامے میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف پشت کیے کھڑی ہے۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ مبالغہ آمیز حُزنیہ لہجہ۔)

کلیئر: وہی دستانے! وہی روز روز کے دستانے! میں نے تمھیں کتنی بار کہا ہے، انھیں کچن میں چھوڑ دیا کرو۔ تم دودھ والے کو ان سے پُھسلانے کی امید میں ہو۔ اوں ہوں، جھوٹ مت بولو، کوئی فائدہ نہیں۔ دستانوں کو سِنک پر لٹکا دو۔ تمھاری سمجھ میں کب آئے گا؟ یہ کمرہ خراب کرنے کے لیے نہیں ہے۔ کچن سے آنے والی ہر چیز فضول ہے۔ اب انھیں چھوڑ دو۔

(اس مکالمے کے دوران سولانژ اپنے دستانے چڑھے ہاتھوں کو توجہ سے دیکھ رہی ہے، جو یکے بعد دیگرے پنکھے کی طرح پھیلتے ہیں اور گلدستے کی شکل میں بند ہوتے ہیں۔)

اپنے کو پریشان مت کرو۔ مور کی طرح بن سنور کر رہو۔ بےتابی مت دکھاؤ، ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ جاؤ۔

(سولانژ کا انداز تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ فرماں‌برداری کے ساتھ ربر کے دستانوں کو اپنی انگلیوں سے پکڑے ہوئے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کلیئر ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ پھولوں کو سونگھتی ہے، آرائشِ حسن کی چیزوں پر اپنا ہاتھ دوڑاتی ہے، اپنے بالوں کو برش کرتی ہے، اپنے گال تھپتھپاتی ہے۔)

میرا لباس تیار کرو۔ جلدی! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ کہاں ہو تم؟

(مڑتی ہے۔)

کلیغ! کلیغ!

(سولانژ اندر داخل ہوتی ہے۔)

سولانژ: معافی چاہتی ہوں مادام! میں چائے بنا رہی تھی۔

(وہ اس کا تلفظ "چا" ادا کرتی ہے۔)

کلیغ: میری چیزیں نکال دو۔ سفید ستاروں والا لباس، میرا دستی پنکھا، زیورات۔

سولانژ: بہت بہتر مادام! مادام کے تمام زیورات؟

کلیغ: سب نکال دو، میں پسند کر لوں گی۔ اور ہاں، میرے پیٹنٹ لیدر کے سلیپر بھی! وہی جن پر بہت دنوں سے تمہاری نگاہ ہے۔

(سولانژ الماری سے زیورات کے بکس باہر نکالتی ہے، انہیں کھولتی ہے اور پلنگ پر پھیلا دیتی ہے۔)

مجھے پورا یقین ہے تم انہیں اپنی شادی میں پہننا چاہتی ہو۔ مان لو کہ اس نے تمہیں پھنسا لیا ہے۔ خود کو ذرا دیکھو! تم بڑی ہو چکی ہو۔ اب اس بات کو تسلیم کر لو۔

(سولانژ قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے، پیٹنٹ لیدر کے جوتوں پر تھوکتی ہے اور ان کو چمکاتی ہے۔)

میں نے تم سے کہا ہے، تھوک کے بغیر! انہیں اپنے پاس سونے دو، مَیلا ہونے دو! ہا ہا!

(وہ پریشان ہو کر کھسیائی ہنسی ہنستی ہے۔)

تم کتنی ڈراونی ہو، جھک کر میرے جوتے میں اپنی شکل تو دیکھو! مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ میرا پیر تمہارے تھوک کے غلاف میں دفنایا ہوا ہے، تمہاری دلدلوں کی دھند میں۔

سولانژ: (اپنے گھٹنوں پر اور بہت عاجزی سے) میری خواہش ہے مادام اور حسین نظر آئیں۔

کلیغ: میں حسین نظر آؤں گی۔

(آئینے کے سامنے خود کو آراستہ کرتی ہے۔)

میں حسین نظر آؤں گی، اتنی حسین کہ تم زندگی بھر نہ ہو سکو گی۔ اس جسم اور اس صورت کے ساتھ تم کبھی بھی ماریو کو جیت نہیں سکو گی۔

(حُزنیہ لہجے کو ختم کرتے ہوئے) ایک بیہودہ دودھ والا تمہیں دھتکار دیتا

ہے! اور اگر تمھیں اس سے بچہ ہو جائے؟

سولانژ: اوہ! تو تو کبھی بھی---

کلیغ: (شروع کرتے ہوئے) خاموش رہو۔ میرا لباس؟

سولانژ: (الماری میں تلاش کرتی ہے، کچھ کپڑوں کو ہٹاتی ہے۔) سرخ لباس! مادام سرخ لباس پہنیں گی۔

کلیغ: میں نے سفید لباس کہا ہے، وہ جس پر ستارے ٹکے ہوئے ہیں۔

سولانژ: (اعتماد سے) میں معذرت چاہتی ہوں، مادام آج شام سرخ مخمل کا لباس پہنیں گی۔

کلیغ: (بھولپن سے) کیوں؟

سولانژ: (سردمہری سے) مخمل کی تہوں میں مادام کے سینے کو فراموش کرنا ناممکن ہے، جب مادام آہیں بھر بھر کر موسیو کو میری عقیدت مندی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ آپ کی بیوگی کا تقاضا ہے کہ آپ مکمل سیاہ لباس میں نظر آئیں۔

کلیغ: اوہ!

سولانژ: آپ کچھ اور سننا چاہتی ہیں؟ عقلمند کو---

کلیغ: آہ، تم کچھ سنانا چاہتی ہو؟ خوب! مجھے دھمکیاں دو۔ اپنی مالکہ کی توہین کرو۔ سولانژ، تم موسیو کی مصیبتوں کا ذکر کرنا چاہتی ہو، ٹھیک؟ بےوقوف! یہ ان کے ذکر کا موقع نہیں، مگر پھر بھی، میں اس معاملے کو دیدہ زیب شکل میں ڈھال دوں گی۔ تم مسکرا رہی ہو؟ تمھیں اس میں شبہ ہے؟

سولانژ: ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ یہ انکشاف---

کلیغ: انکشاف؟ خوب! میری بدنامی کا انکشاف؟

سولانژ: مادام---

کلیغ: تمھارے رحم و کرم پر پڑی رہوں، کیوں‌کہ میں نے موسیو کی پولیس سے مخبری کی، انھیں بیچ دیا؟ مجھے اذیت نہیں ہوئی؟ کلیغ، میں نے اپنے ہاتھوں کو اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا جس نے میرے محبوب کو جیل میں پہنچا دیا۔ تم میرا ساتھ دینے کے بجائے میرا مذاق اڑا رہی ہو؟ اپنی پسند کے رنگ مجھے پہنوا رہی ہو؟ بیوہ ہونے کی بات کرتی ہو؟ وہ ختم نہیں ہو گئے، کلیغ! موسیو کو ایک جیل سے دوسری جیل میں ڈالا جائے گا، کالے پانی بھیج دیا

جائے گا۔ مگر میں ان کے پیچھے جاؤں گی۔ میں ان کی عظمت کی شریک بنوں گی۔ تم بیوہ ہونے کی بات کر کے مجھے سفید گاؤن سے محروم کرنا چاہتی ہو؟ سفید گاؤن ملکاؤں کا تعزیتی لباس ہے، تم جانتی ہو؟

سولانژ: (سردمہری سے) مادام سرخ لباس پہنیں گی۔

کلیغ: (سادگی سے) اور نہیں تو کیا! (درشتی سے) چلو کپڑے اٹھا کر مجھے دو۔ کوئی بھی تو میرا دوست نہیں۔ تمھیں بھی تو مجھ سے نفرت ہے۔

سولانژ: میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔

کلیغ: مالکہ سے محبت تو ہونی ہی چاہیے۔ تم محبت کرتی ہو، میری عزت کرتی ہو، اور تمھیں توقع ہے میں اپنی وصیت میں کچھ چھوڑ جاؤں گی تمھارے لیے۔

سولانژ: میں ناممکن کر دکھاؤں گی۔

کلیغ: (طنز سے) جانتی ہوں! تم مجھے آگ میں ڈال دو گی۔

(سولانژ کلیغ کو کپڑے پہننے میں مدد دیتی ہے۔)

ذرا اسے بند کرنا۔ ارے اتنے زور سے مت۔۔۔

(سولانژ کلیغ کے قدموں پر جھکتی ہے اور لباس کی تہوں کو درست کرتی ہے۔)

تم مجھے نوچ رہی ہو! تم جانور کی طرح مہکتی ہو۔ یہ تو ان کوٹھریوں کی بدبو ہے جہاں اردلی رات کو تمھارے پاس آیا کرتے ہیں، ملازمہ کا کمرہ۔ (ازراہِ نوازش) کلیغ، میں صرف یادداشت کے لیے چھت کے نیچے والے کمرے کی بدبو کا ذکر کر رہی ہوں۔ اس کمرے کا جہاں جڑواں چارپائیوں پر دو بہنیں سوتے میں ایک دوسرے کا خواب دیکھتی ہیں۔ وہاں۔۔۔

(وہ کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

وہاں لوہے کی چارپائیاں ہیں، جن کے بیچ ایک نائٹ ٹیبل ہے۔ اور وہاں پر۔۔۔

(مخالف سمت میں اشارہ کرتی ہے۔)

چیڑ کی لکڑی کا سنگھاردان ہے، جس میں مقدس مریم کا ایک طاق ہے۔

سولانژ: اگر آپ ایسی ہی باتیں کریں گی تو میں رو دوں گی۔

کلیغ: چلو تمھاری دعاؤں کا معاملہ رہنے دیتے ہیں! اور کاغذ کے پھول اور یہ مُقدس شاخ۔۔۔

(وہ کمرے میں پھولوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

ان پھولوں کو دیکھو جو میری شان میں کِھلے ہیں۔ کلیغ، کیا میں کنواری مریم سے کم خوبصورت ہوں؟
سولانژ: (جیسے پرستش کر رہی ہو) اور کچھ نہ کہیے۔
کلیغ: اور وہاں پر---
(وہ کھڑکی کے بہت اوپر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)

وہ بدنام روشندان، جس میں سے ایک آدھ ننگا دودھ والا تمھارے بستر پر کودتا ہے۔
سولانژ: آپ خود کو فراموش کر رہی ہیں مادام---
کلیغ: تمھارے ہاتھوں کا کیا حال ہے؟ ان کو بھول مت جانا۔ میں نے کتنی بار--- (وہ ہچکچاتی ہے) بڑی تکلیف سے کہا ہے، تمھارے ہاتھ سنک کو گندا کر دیتے ہیں۔
سولانژ: (کلیغ کے کولھوں پر لباس کو درست کرتے ہوے) آپ کے لباس کی فال! میں آپ کے زوال کو خوبصورت بنا رہی ہوں۔
کلیغ: دور ہو کام چور!
(وہ سولانژ کی کنپٹی پر جوتے کی لوئی پانزدہم ایڑی سے ٹھوکر لگاتی ہے۔ سولانژ جو اپنے گھٹنوں پر جھکی ہے، لڑکھڑاتی ہے اور پیچھے کو ہو جاتی ہے۔)
سولانژ: میں اور چور!
کلیغ: میں نے کام چور کہا ہے۔ ریں ریں کرنا ہے تو جاؤ اپنی کوٹھری میں۔ میری خواب گاہ معزز آنسوؤں کے لیے ہے، میرے بیش قیمت آنسوؤں کے لیے، جن سے ایک دن میرے گاؤن کا کنارا جڑا جائے گا۔ میرے گاؤن کا کنارا درست کرو۔
سولانژ: (وجد میں) مادام بہک رہی ہیں۔
کلیغ: وہ مجھے اپنے مہکتے ہوے بازوؤں میں لیے ہوے ہے۔ میں زمین سے بلند ہو رہی ہوں---
(وہ ایڑی زور سے فرش پر مارتی ہے۔)
مگر میں پیچھے رہ جاتی ہوں--- میرا نکلیس لاؤ! جلدی، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر گاؤن لمبا ہے تو سیفٹی پن سے ذرا سا ٹانک دو۔

(سولانژ کھڑی ہوتی ہے اور زیورات کے بکس سے نکلیس لینے جاتی ہے، مگر کلیغ اس سے پہلے دوڑ پڑتی ہے اور زیورات چھین لیتی ہے۔ اس کی انگلیاں سولانژ کی انگلیوں سے مَس ہوتی ہیں۔ وہ خوف سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔)

دور رکھو اپنے ہاتھ! میں تم سے چھوا جانا برداشت نہیں کر سکتی۔

سولانژ: تکلّف سے کام مت لیں، آپ کی آنکھیں جل رہی ہیں۔

کلیغ: (صدمے اور حیرت سے) کیا کہا تم نے؟

سولانژ: مجبوریاں اور حدیں مادام! سرحدیں ریت نہیں قانون ہیں۔ یہاں میری زمین، وہاں تمھارا ساحل۔

کلیغ: تم کیسی باتیں کر رہی ہو کلیغ؟ تم مجھے جتا رہی ہو کہ میں نے سمندروں کو پار کر لیا۔ تم مجھے جلاوطن کر رہی ہو۔ مجھ سے انتقام؟ تمھیں آنے والا وقت نظر آ رہا ہے، جب تم ایک خادمہ نہیں رہو گی۔

سولانژ: آپ میرے دل کا حال جان لیتی ہیں۔

کلیغ: (بہت زیادہ بےخود ہوتے ہوے) خادمہ نہیں رہو گی؟ تم مجسّم انتقام ہو! مگر کلیغ، یہ مت بھولنا--- سن رہی ہو نا؟ مت بھولنا--- انتقام کا منصوبہ ایک خادمہ ہی نے بنایا تھا، اور میں--- کلیغ، تم سن نہیں رہی ہو!

سولانژ: (بےدھیانی سے) میں سن رہی ہوں۔

کلیغ: مجھ میں انتقام اور خادمہ دونوں موجود ہیں۔ میں ان کو زندگی کا موقع، نجات کا موقع دیتی ہوں۔ کلیغ! مالکہ ہونا، نفرت کے تمام دریاؤں پر قابو پانا، کوڑے کا وہ ڈھیر بننا جس پر تم کِھلی ہو، بہت تکلیف دہ ہے۔ تم مجھے ہر روز لباس کے بغیر دیکھنا چاہتی ہو۔ میں خوب صورت ہوں، اور محبت میں مایوسی مجھے اور خوب صورت بنا دیتی ہے، مگر تم جانتیں نہیں مجھے کتنی قوّت چاہیے۔

سولانژ: (حقارت سے) آپ کا عاشق---

کلیغ: میرا بدقسمت عاشق میری عظمت میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر تمھیں اپنی کمینگی کے سوا اور کیا معلوم!

سولانژ: (سردمہری سے) اتنا بہت ہے! اب جلدی کریں، تیار ہو جائیں۔

کلیغ: کیا تم تیار ہو؟

سولانژ: (کپڑوں کی الماری کی طرف لوٹتی ہے۔) تیار ہوں--- میں نفرت کا نشانہ بنتے بنتے تنگ آ گئی ہوں۔ مجھے آپ سے نفرت ہے! آپ کے مہکتے ہوے

سینے سے نفرت ہے، آپ کی--- ہاتھی دانت کی چھاتیوں سے، آپ کی--- سونے کی رانوں سے، آپ کے--- عنبر کے پیروں سے! مجھے نفرت ہے!

(وہ سرخ لباس پر تھوکتی ہے۔)

کلیغ: (ششدر) مگر---

سولانژ: (اس کی طرف آتے ہوئے) ہاں، میری حسین مالکہ! آپ سمجھتی ہیں آپ جو چاہیں ہمیشہ کر سکتی ہیں؟ مجھے آسمان کے حسن سے محروم کر سکتی ہیں؟ اپنے لیے عطر اور غازہ پسند کریں، نیل پالش اور ریشم اور کمخواب پسند کریں، اور مجھے ان سے محروم کر دیں؟ دودھ والے کو مجھ سے چھین لیں؟ بولیے، دودھ والے کے بارے میں بولیے۔ اس کی نوجوانی آپ کو بےتاب نہیں کر دیتی؟ دودھ والے کے بارے میں کیوں نہیں بولتیں؟ میں، سولانژ، آپ سے کہتی ہوں، میری طرف سے جہنّم میں جائیں---

کلیغ: (وحشت زدہ) کلیغ! کلیغ!

سولانژ: ہوں؟

کلیغ: (سرگوشی میں) کلیغ، سولانژ، کلیغ!

سولانژ: ---میں، کلیغ، آپ سے کہتی ہوں، میری طرف سے جہنّم میں جائیں۔ کلیغ یہاں ہے، پہلے سے بھی زیادہ تابندہ!

(وہ کلیغ کو تھپّڑ مارتی ہے۔)

کلیغ: آہ! کلیغ--- تم---

سولانژ: مادام اپنی پھولوں کی دیوار میں خود کو محفوظ سمجھتی تھیں، جیسے کسی خوش قسمتی، کسی قربانی نے انھیں بچا رکھا ہے۔ مگر انھیں ایک خادمہ کی بغاوت کا گمان نہیں تھا۔ اس کے طیش کا تماشا دیکھیے مادام--- وہ آپ کی حسین گفتگو تباہ کر دیتی ہے، آپ کے کارنامے کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ آپ کے موسیو گھٹیا اُچکّے ہیں اور آپ---

کلیغ: منع کرتی ہوں۔ بس!

سولانژ: منع کرتی ہیں؟ مگر آپ رد ہو چکی ہیں مادام! آپ کا چہرہ بگڑ رہا ہے۔ آئینہ دیکھیں گی آپ؟ یہ رہا آئینہ۔

(وہ کلیغ کو آئینہ تھماتی ہے۔)

کلیغ: (اپنےآپ کو طمانیت سے دیکھتے ہوئے) تمانچے کا نشان؟--- مگر میں

اور زیادہ خوب صورت لگ رہی ہوں۔
سولانژ: ہاں، تمانچا!
کلیغ: خطرہ میرے لیے نورانی تاج ہے کلیغ! اور تم، تم تاریکیوں میں پڑی ہو۔
سولانژ: مگر تاریکی ہی خطرہ ہے۔ معلوم ہے مجھے، میں نے یہ سارا کچھ پہلے بھی سن رکھا ہے۔ آپ کی شکل دیکھ کر بتا سکتی ہوں کیا جواب دینا ہے۔ اس لیے اب میں یہ سب ختم کرتی ہوں۔ اب یہاں پر دو خادمائیں ہیں۔ دو وفادار نوکرانیاں آپ کے سامنے کھڑی ہیں۔ انھیں دھتکاریں اور خوب صورت بنیں۔ ہمیں آپ کا ڈر نہیں۔ ہم اپنے غصّے، اپنے جشن میں مست ہیں۔ ہمیں آپ سے نفرت کا نشہ ہے۔ ہمارا سانچا ڈھل چکا ہے۔ ہم تیار ہونے والے ہیں۔ ہنسیے مت، میری لفاظی پر ہنسیے مت۔
کلیغ: نکل جاؤ۔
سولانژ: جا رہی ہوں! مگر صرف اس لیے کہ مادام کی آئندہ خدمت بجا لا سکوں۔ میں کچن میں جا رہی ہوں، اپنے دستانوں، اپنے سڑے ہوئے دانت، اپنے اُبلتے ہوئے سِنک کے پاس۔ آپ کے پاس آپ کے پھول ہیں، میرے پاس میرا سِنک ہے۔ میں خادمہ ہوں۔ آپ میری بےحرمتی نہیں کر سکتیں۔ مگر---

(وہ کلیغ کی طرف دھمکاتے ہوئے بڑھتی ہے۔)

مگر واپس جانے سے پہلے میں اپنا کام ختم کروں گی۔

(اچانک الارم کلاک بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ سولانژ ٹھہر جاتی ہے۔ دونوں اداکارائیں ہیجان کے عالم میں ایک ساتھ دوڑتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر کچھ سننے کی کوشش کرتی ہیں۔)

ابھی سے؟
کلیغ: مادام آتی ہوں گی۔ (اپنا لباس کھولنے لگتی ہے۔) میری مدد کرو۔ وقت پورا ہو گیا ہے، اور تم انجام تک نہیں پہنچ سکیں۔
سولانژ: (اس کی مدد کرتے ہوئے، اداس آواز میں) ہر بار یہی ہوتا ہے، تمھاری وجہ سے! تم بھی جلد تیار ہی نہیں ہو پاتیں۔
کلیغ: ہم شروعات میں بہت وقت لگا دیتے ہیں۔ پھر بھی ہمارے پاس ابھی---
سولانژ: (کلیغ کو لباس اتارنے میں مدد دیتے ہوئے) گھڑی پر نظر رکھو۔
کلیغ: ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہے۔ میں نے الارم کچھ آگے لگایا تھا۔

(وہ تھک کر کرسی میں گر جاتی ہے۔)

سولانژ: (نرمی سے) ہم اس کے بہت قریب تھے۔
کلیغ: (نرمی سے) ہاں!
سولانژ: کیا یہی غم ہمیں کھائے جارہا ہے، کلیغ؟
کلیغ: ہاں!
سولانژ: وقت ہو گیا؟
کلیغ: ہاں!
(وہ تھکی ہوئی سی اٹھتی ہے۔)
میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔
سولانژ: کھڑکی پر نظر رکھو۔
کلیغ: ابھی وقت ہے۔

(وہ اپنا منہ پونچھتی ہے۔)
سولانژ: تم ابھی تک اپنےآپ کو دیکھ رہی ہو؟ کلیغ--- جان---
کلیغ: مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں تھک گئی ہوں۔
سولانژ: (سختی سے) کھڑکی پر نظر رکھو۔ تم نے تمام کمرہ پھر سے خراب کر دیا۔ تمھیں مادام کا گاؤن بھی صاف کرنا ہے۔
(وہ اپنی بہن کو گھورتی ہے۔)
کیا بات ہے؟ دوبارہ کلیغ بن جاؤ۔ دوبارہ میری بہن ہو جاؤ۔
کلیغ: میں ختم ہو چکی ہوں۔ یہ روشنی مجھے مار ڈالے گی۔ سامنے مکان والے کیا--- .
سولانژ: مجھے پروا نہیں! تم چاہتی ہو--- (وہ ہچکچاتی ہے) ہم اندھیرے میں چیزوں کو ٹھیک سے رکھیں؟ تھوڑا سا آرام کر لو۔ اپنی آنکھیں موند لو۔ آنکھیں موند لو، کلیغ!
کلیغ: (وہ اپنا مختصر سیاہ لباس پہنتی ہے۔) جب میں کہتی ہوں تھک گئی، تو اس کا مطلب سچ مچ تھک جانا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ رحم کھانے کے لیے میری تھکن کو استعمال مت کرو۔ بند کرو مجھ پر حکم چلانے کی کوشش۔
سولانژ: میں نے کبھی حکم چلانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی کہہ رہی ہوں آرام کر لو۔ آرام کر کے تم میری زیادہ مدد کرو گی۔
کلیغ: معلوم ہے مجھے۔ وضاحت مت کرو۔

سولانژ: مگر میں وضاحت کروں گی۔ یہ سب میرا شروع کیا ہوا ہے۔ جب تم نے دودھ والے کا ذکر کیا، کیا مجھے پتا نہیں تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟ اگر ماریو۔۔۔

کلیغ: اوہ!

سولانژ: دودھ والا مجھ سے گندی باتیں کرتا ہے تو تم سے بھی تو کرتا ہے۔

کلیغ: (اپنے کاندھے جھٹکتے ہوے) دیکھنا، ہر چیز ٹھیک سے رکھ دی گئی؟ ارے سیکریٹری کی کنجی ایسے تھوڑے ہی رکھی تھی۔

(وہ کنجی کو ٹھیک سے رکھتی ہے۔)

اور جیسا موسیو کہتے ہیں۔۔۔

سولانژ: (شدت سے) تمھیں اپنی بےعزتی سے پیار ہے۔

کلیغ: ان کو ہمیشہ خادماؤں کے بال گلابوں کے اوپر نظر آ جاتے ہیں۔

سولانژ: اور ہماری ذاتی زندگی، ہمارے تعلقات۔

کلیغ: کس کے ساتھ؟ کس کے ساتھ تعلقات؟ نام لو۔ یہ تقریب ختم ہونے کو ہے، بحث میں وقت ضائع مت کرو۔ وہ آ رہی ہو گی، واپس آ رہی ہو گی۔ مگر سولانژ، اس بار ہم نے اسے زیر کر لیا ہے۔ مجھے تم سے جلن ہو رہی ہے۔ کاش میں اس وقت اس کے پاس ہوتی جب اسے اپنے عاشق کی گرفتاری کی خبر ملی تھی۔ زندگی میں ایک کام تو کِیا میں نے، تم کو ماننا چاہیے۔ اگر میں نہ ہوتی، اگر میرا گم نام خط نہ ہوتا تو ہمیں ایسا دل چسپ منظر کہاں دیکھنے کو ملتا۔ عاشق کی ہتھکڑی اور مادام کے آنسو۔ جان دے دیں گی وہ۔ آج صبح بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑی ہو سکی تھیں۔

سولانژ: بہت خوب! وہ مر جائے اور مجھے اس کی دولت مل جائے۔ پھر اس گندی کوٹھری میں قدم نہ رکھنا پڑے۔ کمینے باورچی اور خانساماں سے جان چھوٹے۔

کلیغ: مجھے تو اپنی کوٹھری اچھی لگتی تھی۔

سولانژ: صرف میری مخالفت میں، اب جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے نفرت ہے اس کوٹھری سے۔ مجھے وہ ویسی ہی لگتی ہے جیسی حقیقت میں ہے؛ بےسروساماں، حقیر۔ اور غلیظ۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم خود بھی تو غلاظت ہی ہیں۔

کلیغ: اب دوبارہ بحث مت شروع کرو، کھڑکی پر نظر رکھو۔ باہر کتنا اندھیرا ہے!

سولانژ: کوٹھری مجھے پسند تھی، وہاں سادگی تھی، وہاں مجھے دکھاوا نہیں کرنا پڑتا تھا، کوئی پردہ نہیں جس کو ہٹانا پڑے، کوئی قالین نہیں جس کو جھاڑنا پڑے، کوئی آئینہ نہیں، کوئی بالکنی نہیں--- چلو، تم ملکہ بننے کا کھیل کھیلتی رہو۔ رات گئے اپارٹمنٹ کے باہر چہل قدمی فرماتی رہو۔

کلیغ: پاگل ہو تم! میں نے کبھی اپارٹمنٹ کے باہر چہل قدمی نہیں کی۔

سولانژ: (طنز سے) نہیں، مادموازیل کبھی ہواخوری کو نہیں نکلیں! کبھی اپنے پردے اور جھالردار چادر میں خود کو لپیٹ کر نہیں نکلیں۔ رات کو دو بجے بالکنی پر آئینہ دیکھتی ہوئی اِترا اِترا کر نہیں چلیں۔ کبھی نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر نہیں مسکرائیں۔

کلیغ: مگر سولانژ---

سولانژ: آپ شاید سمجھتی ہیں کہ اندھیرے میں اپنی بالکنی سے نظر نہیں آتیں--- تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟ اب یہ مت کہنا کہ تم خواب میں چلتی ہو۔ آج ہم جہاں تک پہنچ گئے ہیں تم ہر بات کا اعتراف کر سکتی ہو---

کلیغ: مگر سولانژ، تم تو چلا رہی ہو! پلیز، پلیز، کم کرو اپنی آواز--- مادام آہستہ سے بھی آ سکتی ہیں۔

(وہ کھڑکی کی طرف دوڑتی ہے اور پردہ اٹھاتی ہے۔)

سولانژ: مجھے جو کہنا تھا کہہ چکی۔ پردہ گرا رہنے دو۔ بالکل اسی طرح موسیو نے اسے اٹھایا تھا جب وہ پولیس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

کلیغ: اب تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟ ذرا سی آہٹ اور تم اس قاتل کی طرح لرزنے لگیں جس سے بھاگا نہ جا رہا ہو۔

سولانژ: بولے جاؤ۔ اور طنز کرو--- کسی کو مجھ سے محبت نہیں--- کسی کو ہم سے محبت نہیں۔

کلیغ: وہ کرتی ہیں۔ وہ کرتی ہیں ہم سے محبت، ہم پر مہربانی۔ مادام کتنی نیک ہیں۔ مادام تو ہماری پرستش کرتی ہیں۔

سولانژ: ایسی ہی محبت جیسی اپنی آرام کرسی سے کرتی ہیں۔ بلکہ اتنی بھی

کہاں، شاید انہیں ہم سے اتنی محبت ہو جتنی اپنی گلابی چمکدار ٹوائلٹ کی سیٹ سے ہے۔ اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔ غلیظ۔۔۔

کلیغ: اُف!

سولانژ: اور غلاظت کو غلاظت سے محبت نہیں۔ کب تک ہم راتوں کو یہ کھیل کھیلتے رہیں گے اور پھر اپنی سڑی ہوئی چارپائی پر پڑ رہیں گے؟ ہم کب تک ایسا کرنے کے قابل رہیں گے؟ اگر کسی پر، جو مجھے کلیغ پکارتی ہے، میں نہ تھوکوں تو میرا تو دم گھٹ جائے۔ میری تھوک کی دھار میرے ہیروں کی بارش ہے۔

کلیغ: (کھڑی ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے۔) اور نرمی سے بولو، پلیز! پلیز! بولو، مادام کی شفقتوں کے بارے میں بولو۔

سولانژ: ان کی شفقتیں، وہ شفقتیں ہیں؟ مہربان ہونا، مسکراتے رہنا بہت آسان ہے۔ ان کی نرم دلی۔۔۔ آہ جب کوئی خوب صورت ہو، دولت مند ہو تو نرم دل بھی ہو سکتا ہے۔ کیا ہوا جو تم صرف ایک خادمہ ہو؟ زیادہ سے زیادہ تم جھاڑو دیتے وقت یا پوچھا لگاتے وقت تھوڑا سا غرور کر سکتی ہو۔ پروں والی جھاڑو کو پنکھے کی طرح گھما سکتی ہو۔ پلیٹ دھونے والے کپڑے سے کچھ دلکش اشارے دے سکتی ہو۔ یا، جیسے تم، مادام کے اپارٹمنٹ میں تاریخ ساز پریڈ کر کے اپنی شان بڑھا سکتی ہو۔

کلیغ: سولانژ! تم پھر شروع کر رہی ہو۔ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ ایسی باتیں کر کے تم بھی سکون سے نہیں رہ سکو گی۔ میں بھی تمھارے بلرے میں ایک دو باتیں کہہ سکتی ہوں۔

سولانژ: تم؟

کلیغ: ہاں میں! اگر میرا دل چاہے تو کہہ نہیں سکتی کیا؟ کیوں‌کہ آخرکار۔۔۔

سولانژ: آخرکار کیا؟ کون سا الزام دے رہی ہو مجھے؟ اس آدمی کے بارے میں تمھیں نے باتیں شروع کی تھیں۔۔۔ کلیغ، مجھے تم سے نفرت ہے۔

کلیغ: مجھے تم سے اور زیادہ نفرت ہے، مگر میں تمھیں اذیت دینے کے لیے دودھ والے کا نام نہیں لوں گی، میرے پاس اس سے بہتر حربہ ہے، اور تم اسے جانتی ہو۔

سولانژ: کون کسے زیر کرنے جا رہا ہے؟ ذرا بتانا۔
کلیغ: پہلے تم شروع کرو، سولانژ، تم میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔ مجھے میری بدترین حرکت پر الزام مت دو۔ وہی میرے خطوط۔ ہماری کوٹھری ان سے بھر گئی تھی۔ میں نے کیا شان دار کہانیاں تیار کیں اور تم نے انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ میرے جنون کو ضائع کر دیا۔ کل شام مادام بنتے ہوئے تم کتنی خوش تھیں۔ تم کتنی پُرعظمت تھیں اپنے عاشق کے ساتھ جلا وطن ہوتے ہوئے!
سولانژ: کلیغ!
کلیغ: تمھارے عاشق کو کالے پانی بھیجا جا رہا ہے۔ تمھیں خوشی تھی، میرے خطوط نے تمھیں ایک چور کے قدموں پر جھکی ہوئی طوائف بننے کا موقع دیا۔ ایک چور کی ہٹ دھرمی کی سولی اٹھا کر، اس کی کالک پونچھ کر، اس کی مشقت بانٹ کر، تم سمجھتی تھیں تم بہت عظیم ہوتی جا رہی ہو۔
سولانژ: اور تم؟ تم خود ابھی اس کے پیچھے ہر جگہ جانے کی بات کر رہی تھیں---
کلیغ: میں انکار نہیں کرتی۔ جہاں پر تم نے چھوڑا تھا میں نے وہیں سے شروع کیا۔ مگر اتنی وحشت سے نہیں--- کوٹھری میں بھی تمام خطوط کے درمیان تم کشتی کی طرح ڈولا کرتی تھیں۔
سولانژ: تم اپنے کو نہیں دیکھتیں!
کلیغ: دیکھتی ہوں۔ میں تم سے زیادہ ہوش مند ہوں۔ کہانی گھڑنے والی تم ہو۔ سولانژ، تمھارا چہرہ اس سورج کی گرمی سے روشن ہے جو اچھوتے جنگل میں ڈوب رہا ہے۔ تم اس کے فرار کا منصوبہ بنا رہی ہو--- (کمزور ہنسی) مگر پریشان مت ہو، تمھارے پُرمسرّت سفر میں خلل ڈالنا ظلم ہو گا۔ مجھے تم سے نفرت ہے، کسی اور وجہ سے۔ اور تم جانتی ہو!
سولانژ: (اپنی آواز مدھم کرتے ہوئے) میں تم سے ڈرتی نہیں۔ تمھیں مجھ سے نفرت ہے نا؟ مجھے معلوم ہے۔ معلوم ہے کہ تم چغل خور ہو۔ اب ہوشیار رہنا۔ میں تم سے بڑی ہوں۔
کلیغ: تو کیا ہوا؟ بڑی بہن! اور زیادہ طاقت ور بھی؟ تم اس آدمی کے بارے میں بکوا کر مجھے موضوع سے ہٹانا چاہتی ہو۔ ہونہہ! تم جانتی ہو کہ میں

نے تمھیں پکڑ لیا ہے۔ تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی۔
سولانژ: مجھ پر الزام لگا رہی ہو؟
کلیغ: انکار مت کرو۔۔۔ میں نے تمھیں دیکھ لیا تھا۔
(ایک طویل خاموشی۔)
اور میں خوف زدہ ہو گئی تھی، سولانژ، خوف زدہ۔ اس کے ذریعے تم مجھے نشانہ بنا رہی تھیں۔ میں ہی تمھارے لیے خطرہ ہوں، جب ہم یہ تقریب ختم کریں گے، میں اپنی جان بچا لوں گی۔
(طویل خاموشی۔ سولانژ اپنے کاندھے جھٹکتی ہے۔)
سولانژ: (فیصلہ کن انداز میں) اور کچھ کہنا ہے؟ ہاں، کی تھی میں نے کوشش۔ تمھیں آزاد کرنا چاہا تھا۔ اور زیادہ مجھ میں برداشت نہیں تھی۔ تمھیں گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھ کر، میرا بھی دم گھٹ رہا تھا۔ نہیں دیکھا جاتا تھا مجھ سے تمھیں اس عورت کے زہر اور اس کی مٹھاس میں سڑتے ہوے۔ دے دو مجھے اس کا الزام۔ میں نے بہت محبت کی تم سے۔ اگر میں اسے مار دیتی، سب سے پہلے تم پولیس کو اطلاع دیتیں، مجھے قید کرواتیں، تم!
کلیغ: (اس کی کلائی پکڑ لیتی ہے۔) سولانژ!
سولانژ: (خود کو چھڑاتے ہوے) تم کیوں ڈرتی ہو؟ یہ میرا معاملہ ہے۔
کلیغ: سولانژ، میری بہن، میری چھوٹی سی بہن! اب وہ آتی ہو گی۔
سولانژ: میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں بزدل تھی، اس سے زیادہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس نے نیند میں کروٹ بدلی۔ (زیادہ وجد میں) وہ آہستہ آہستہ سانسیں لے رہی تھی۔ وہ مادام ہی تھی۔
کلیغ: بس کرو۔
سولانژ: اب تم مجھے روکتی ہو؟ ٹھیک ہے، مجھے تم سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ تمھیں پتا چلے گا تمھاری بہن کیا ہے۔ ایک خادمہ لڑکی کی حقیقت کیا ہے۔ میں اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی۔
کلیغ: مجھے چھوڑو۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ سوچو۔
سولانژ: کچھ نہیں ہو گا۔ میں سجدے میں گرنے سے تنگ آ گئی ہوں۔ چرچ میں مجھے اعلیٰ ترین راہبہ بنا دیا جاتا یا میں ندامت میں سنگسار ہو جاتی،

تو بھی ایک باعزت بات ہوتی- ذرا دیکھو وہ کیسے اداس ہو رہی ہے! وہ اپنی اداسی کو کتنا خوب صورت بنا دیتی ہے- غم اس کی شخصیت کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے- اسے معلوم ہوا اس کا عاشق چور ہے اور وہ پولیس کے سامنے کھڑی ہو گئی- اب وہ بےکس ہے اور شان دار لگ رہی ہے- دو جاں‌نثار خادمائیں اس کے غم میں خون کے آنسو رو رہی ہیں، اسے سہارا دینے کو تڑپ رہی ہیں- اس کا غم اس کے زیورات کی چکاچوند میں جگمگ جگمگ کر رہا ہے- اس کے گاؤن کی ساٹن؛ اس کے فانوس کی لو--- کلیغ، میں اپنے غم کی ناداری کو اپنے جرم کی شان و شوکت میں چھپانا چاہتی تھی- اس کے بعد میں ہر چیز کو آگ لگا دیتی-

کلیغ: سولانژ، جوش میں مت آؤ- شاید آگ نہ لگتی- انھیں پتا چل جاتا- جانتی ہو آتش زن کا انجام کیا ہوتا ہے-

سولانژ: سب پتا ہے- جس طرح میری آنکھیں اور کان دروازوں پر لگے رہتے ہیں، وہ کسی خادمہ کے بس کی بات نہیں- میں ہر چیز جانتی ہوں- آتش زن! کیا شان دار خطاب ہے-

کلیغ: چپ ہو جاؤ! میرا دم گھٹ رہا ہے- تم میرا دم گھونٹے دے رہی ہو- (وہ کھڑکی کھولنا چاہتی ہے-) اوہ، تھوڑی سی ہوا آنے دو-

سولانژ: کھڑکی سے ہٹو، چھوٹا کمرہ کھولو، کچن کا دروازہ کھول دو-

(کلیغ دونوں دروازے کھول دیتی ہے-)

جاؤ، دیکھو پانی ابل رہا ہے-

کلیغ: اکیلی چلی جاؤں؟

سولانژ: اچھا ٹھہرو، اس کے آنے تک ٹھہرو- وہ اپنے ستارے، اپنے آنسو، اور مسکراہٹیں، اپنی سسکیاں لا رہی ہے- وہ ہمیں اپنی مہربانی سے مار ڈالے گی-

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے- دونوں بہنیں سنتی ہیں-)

کلیغ: (ٹیلی فون پر) موسیو؟ موسیو مخاطب ہیں؟ کلیغ بول رہی ہوں موسیو-

(سولانژ سننا چاہتی ہے، مگر کلیغ اسے دھکیل دیتی ہے-)

بہت بہتر، میں مادام کو اطلاع دے دوں گی- مادام کو آپ کی رہائی کا سن کر بہت خوشی ہو گی--- جی ہاں موسیو--- بہت بہتر--- خدا حافظ موسیو-

(وہ ریسیور کریڈل پر رکھنا چاہتی ہے مگر اس کا ہاتھ لرزتا ہے اور وہ ریسیور ٹیبل

پر رکھ دیتی ہے۔)

سولانژ: وہ چھوٹ گیا؟

کلیغ: جج نے ضمانت پر رہا کر دیا۔

سولانژ: بڑا کارنامہ انجام دیا تم نے! میری طرف سے مبارک باد۔ تمھاری مخبری، تمھارے خطوط، کتنی ٹھیک نکلی ہر چیز! اگر وہ تمھاری تحریر پہچان لیں تو سب کچھ طے سمجھو۔

کلیغ: اگر تم اتنی چالاک ہو تو تمھیں ہی مادام سے حساب بےباق کر لینا چاہیے تھا۔ مگر تم تو خوف زدہ تھیں۔ بستر گرم تھا، کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا، اور مادام نیند میں تھیں! ہمیں زندگی ایسے ہی کاٹنی ہے۔ اسی پرانے کھیل میں۔ مگر تم بےچاری بدنصیب لڑکی، تمھارے لیے تو یہ کھیل بھی خطرناک ہے۔ مجھے یقین ہے ہم نے کوئی نشانات ضرور چھوڑے ہوں گے۔ ہر بار ہی ہم کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ دیتے ہیں۔ اتنے سارے نشانات ہم کہاں چھپا سکتے ہیں؟ اور وہ، وہ اپنی پالتو مینا لیے آتی ہے۔ وہ نشانات کی طرف اپنے پیر کے گلابی انگوٹھے سے اشارہ کرتی ہے۔ مادام ہم پر ہنستی ہیں۔ صرف تمھاری غلطی سے سب کچھ برباد ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ تم بزدل تھیں۔۔۔

سولانژ: اب بھی بہت طاقت ہے مجھ میں۔

کلیغ: کہاں ہے؟ کہاں ہے تم میں طاقت؟ تم مجھ سے آگے نکل گئی تھیں۔ تم خوابوں میں رہتی ہو، ایک دودھ والے کی محبت میں تمھارے ہاتھ پاؤں چھوٹ جاتے ہیں۔

سولانژ: میں مادام کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی کلیغ۔ میں مادام کے اتنے قریب تھی، اس کی نیند کے اتنے قریب۔۔۔ میری طاقت جواب دے گئی۔ اس کی گردن تک پہنچنے کے لیے مجھے اس کے سینے سے چادر اٹھانی پڑتی۔۔۔

کلیغ: (طنزیہ) اور چادر گرم تھی، اور رات تاریک۔۔۔ ایسی حرکت دن کے وقت کرنی چاہیے! تم سے مشکل ہے، یہ کام بہت ٹیڑھا ہے۔ مگر میں کر سکتی ہوں۔

سولانژ: کلیغ!

کلیغ: تم نے کام خراب کر دیا، مگر میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

سولانژ: (اپنے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔) جلدباز مت بنو۔

کلیغ: تم مجھے جلدباز کیوں سمجھتی ہو؟ اچھا اپنی ہیرپِنوں کو میری ہیرپِنوں میں مت ملاؤ--- تم--- اچھا، اچھا، ملا دو اپنی غلاظت۔ ملا دو اپنے ٹاٹ میرے چیتھڑوں میں، پوری طرح ملا دو۔ پھر بھی ان میں سے خادماؤں کی بُو آئے گی۔ موسیو کو ہمیں دریافت کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی اور ہم ذلت کے سیلاب میں ڈوب کر مر جائیں گے۔ (اچانک پُرسکون) میں ہر بات کر سکتی ہوں، تمھیں معلوم ہے۔

سولانژ: وہ خواب اور گولیاں۔

کلیغ: ہمیں سکون سے سوچنا چاہیے۔ میں بہت مضبوط ہوں۔ تم نے کیوں مجھ پر اپنا رعب ڈالنا چاہا تھا؟

سولانژ: مگر کلیغ---

کلیغ: (سکون کے ساتھ) تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ تیار ہوں۔ میں مکڑی بنے رہنے سے، چھتری کا خول بنے رہنے سے، اپنے پھٹے پرانے کپڑوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ میں تنگ آ گئی ہوں خدا کے بغیر راہبہ بنے رہنے سے۔ میں گھر کے بغیر ہونے سے تنگ آ گئی ہوں۔ میں بدمزاج ہوں، ناپسندیدہ ہوں، تم بھی ایسا ہی سمجھتی ہو---

سولانژ: کلیغ، ہم دونوں پریشان ہیں۔ (تشویش کے ساتھ) مادام کہاں ہیں؟ اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ میں ہم دونوں کا بالکل ایک سا ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔ میں تمھیں بُرا نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں تم اپارٹمنٹ کے باہر صرف سکون کے لیے چہل قدمی کرتی ہو۔

کلیغ: (ناراض ہو کر) ختم بھی کرو!

سولانژ: میں تمھاری مدد کرنا چاہتی تھی، تمھیں آرام پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر مجھے معلوم ہے تمھیں مجھ سے نفرت ہے۔ تمھیں کراہت آتی ہے مجھے دیکھ کر--- یہ بات مجھے اپنی نفرت سے معلوم ہے۔ قیدی آپس میں محبت نہیں کر سکتے۔

کلیغ: میں بھی آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کر بیزار ہو گئی ہوں۔ تم میرا عکس ہو، میری بدبو ہو۔ میں تیار ہوں۔ آج میں اپنا تاج پہنوں گی، اپارٹمنٹ کے باہر چہل قدمی کو نکلوں گی۔

سولانژ: یہ اس کو قتل کرنے معقول جواز نہیں ہے۔
کلیغ: کیوں؟ اور کیا جواز ہو سکتا ہے؟ ہم کہاں سے کوئی معقول بہانہ لائیں گے؟ کافی نہیں ہے کہ ایک دودھ والے سے جو خوش خوش ہماری کوٹھری کے پاس سے گزرتا ہے ہماری عزت لٹ جائے؟ آج مادام ہماری شرمندگی کا مشاہدہ کریں گی۔ ہنستے ہنستے ان کے آنسو نکل آئیں گے۔ ان کی نرم سسکیاں ان کے ساتھ ہوں گی--- نہیں۔ میں یہ تاج پہنوں گی۔ میں وہ قیدی بنوں گی جو تم نہ بن سکیں۔ اب میری باری ہے کہ تمھیں حکم دوں۔
سولانژ: مگر میں کبھی---
کلیغ: تولیہ دینا مجھے۔ کپڑوں کی پنیں تو دینا۔ پیاز چھیل دو۔ گاجریں کاٹ دو۔ ٹائیلز صاف کرو--- بہت ہو چکا! اور ہاں، مجھے یاد ہی نہیں آیا، نل بند کر دو۔ بہت ہو چکا! (وجد میں) اب میں دنیا کو چلاؤں گی۔
سولانژ: میری ننھی بہن!
کلیغ: تم میری مدد کرو گی۔
سولانژ: تمھیں نہیں معلوم کیا حرکت کرنی چاہیے۔ معاملات سنگین بھی ہیں اور بہت سادہ بھی۔
کلیغ: (وجد میں) ہم نے وادیِ مبارک کی مقدس صلیب کی راہبہ کی کہانی پڑھی ہے جس نے ستائیس عربوں کو زہر دے دیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلتی تھی۔ اسے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اور شہزادی البامیرز کی کہانی، اپنے عاشق اور اپنے شوہر کو زہر دینے والی شہزادی۔ بوتل کھولی اور پیمانے پر بڑا سا صلیب کا نشان بنایا۔ لاشوں کے سامنے کھڑے ہو کر موت کو دیکھا۔ ہوا میں اس کی تصویر بھی جا رہی تھی۔ وہ اداسی کی ہر منزل سے گزر چکی تھی۔ کتاب میں ہم نے مارکیز دُ وینوسا کے بارے میں پڑھا ہے، وہی جس نے اپنے بچوں کو زہر دیا تھا۔ جب وہ اپنے بستر کی طرف لوٹی تو اس کے بازوؤں کو اس کے عاشق کی بدروح نے پکڑ لیا۔
سولانژ: تم میں کتنی معصومیت ہے!
کلیغ: مجھے دودھ والے کے مضبوط بازوؤں کا سہارا ملے گا۔ میں اپنا ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دوں گی۔ تم میری مدد کرو گی، اور سولانژ، اگر ہمیں دور جانا ہے، اگر ہمیں کالے پانی تک جانا ہے، تو تم میرے ساتھ جاؤ گی،

کشتی پر سوار ہو گی۔ فرار کا منصوبہ جو تم اس کے لیے بنا رہی تھیں، یہاں استعمال ہو گا۔ ہم دونوں شیطان اور ولی کا ازلی جوڑا بنیں گے۔ اور ہماری نجات ہو جائے گی، میں قسم کھاتی ہوں، سولانژ۔

سولانژ: آرام سے! تمھیں نیند آ رہی ہے، میں تمھیں اوپر لے چلتی ہوں۔

کلیغ: مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ روشنی بند کر دو۔ خدا کے لیے روشنی بند کر دو۔

(سولانژ لائٹ بند کرتی ہے۔)

سولانژ: آرام، آرام کرو میری بہن۔ (وہ جھکتی ہے اور کلیغ کے جوتے اتارتی ہے، اس کے پیروں کو چومتی ہے۔) میری جان! (اسے پیار سے چھوتی ہے۔) اپنے پیر میرے شانوں پر رکھ لو۔ اپنی آنکھیں بند کر لو۔

کلیغ: (سسکیاں لیتی ہے) میں شرمندہ ہوں سولانژ۔

سولانژ: (بہت نرمی سے) بات مت کرو۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تمھیں بستر پر لے جا رہی ہوں۔ اور جب تم سو جاؤ گی تو اٹھا کر اوپر لے جاؤں گی، کوٹھری میں۔ میں تمھارے کپڑے اتاروں گی اور تمھیں چارپائی پر لٹا دوں گی۔ اب سو جاؤ، میں یہیں ہوں۔

کلیغ: میں شرمندہ ہوں سولانژ۔

سولانژ: شش! چلو میں تمھیں ایک کہانی سناؤں۔

کلیغ: (سادگی سے) سولانژ۔

سولانژ: میری معصوم بہن۔

کلیغ: سولانژ، سنو۔

سولانژ: سو جاؤ۔

(طویل خاموشی)۔

کلیغ: تمھارے بال بہت خوب صورت ہیں۔ تمھارے بال بہت زیادہ خوب صورت ہیں۔ اس کے بال۔۔۔

سولانژ: اس کے بارے میں اب کوئی بات نہ کرو۔

کلیغ: اس کے بال مصنوعی ہیں۔

(طویل خاموشی۔)

تمھیں یاد ہے ہم دونوں درخت کے نیچے اکیلے تھے، دھوپ ہمارے پیروں پر

پڑ رہی تھی، سولانژ؟

سولانژ: میں یہیں ہوں۔ سو جاؤ۔ میں تمھاری بڑی بہن ہوں۔

(خاموشی۔ ایک لمحے بعد کلیغ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔)

کلیغ: نہیں، ہمیں کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ روشنی کر دو۔ جلدی۔ یہ ایک عظیم لمحہ ہے۔ (سولانژ روشنی کر دیتی ہے۔) کھڑی ہو جاؤ۔ ہمیں کھانا کھانا چاہیے۔ کچن میں کیا ہے؟ ہمیں کھانا کھانا ہے۔ ہمیں مضبوط رہنا ہے۔ میرے ساتھ آؤ، تم مجھے مشورہ دینا۔ اور وہ نیند کی گولیاں۔

سولانژ: میں بہت تھک چکی ہوں! ہاں، وہ نیند کی گولیاں۔

کلیغ: نیند کی گولیاں! ایسا منھ مت بناؤ۔ ہمیں خوش رہنا چاہیے۔ گاؤ! ہمیں گانا چاہیے۔ گاؤ، اس طرح گاؤ جس طرح تمھیں درباروں اور سفارت خانوں میں مدد مانگنے کے لیے جاتے ہوئے گانا ہے۔ ہنسو! (قہقہہ لگاتی ہے۔) ورنہ، یہ سب کچھ اتنا بھیانک ہو جائے گا کہ ہم کھڑکی سے نیچے گر پڑیں گے۔ (سولانژ ہنستے ہوئے کھڑکی بند کر دیتی ہے۔) قتل چیز ہی ایسی ہے، ناقابلِ بیان!

سولانژ: چلو گانا گاتے ہیں۔ ہم اسے جنگل میں لے جائیں گے اور چیڑ کے درخت کے نیچے چاندنی میں اس کے ٹکڑے کریں گے۔ اور ہم گانا گائیں گے۔ اپنے پھولوں کے بستر میں ہم اسے پھولوں کے نیچے دفن کریں گے اور رات کو ہم اس کے انگوٹھے کو ایک چھوٹی سی نلکی سے پانی دیں گے۔

(باہر دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔)

کلیغ: مادام!

سولانژ: ضرور وہی ہو گی۔ بستر سیدھا کر دو۔ (وہ اپنی بہن کو کلائی سے پکڑتی ہے۔) کلیغ، تمھیں یقین ہے تم کامیاب ہو جاؤ گی؟

کلیغ: ہمیں کتنی گولیوں کی ضرورت پڑے گی؟

سولانژ: تقریباً دس۔ اس کی چائے میں دس گولیاں ڈال دو۔ ڈال سکو گی تم؟

کلیغ: (اپنے آپ کو چھڑاتی ہے، بستر صاف کرنے جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے اسے نظر جما کر دیکھتی ہے۔) ہاں، شیشی میری جیب میں ہے۔

(سولانژ بائیں طرف چلی جاتی ہے۔ کلیغ کمرہ صاف کرنا جاری رکھتی ہے اور دائیں طرف چلی جاتی ہے۔ کئی سیکنڈ گزرتے ہیں۔ بیک اسٹیج پر بےجان قہقہوں کا شور۔ مادام کمرے میں ہنستے ہوئے داخل ہوتی ہیں۔ سولانژ ان کے پیچھے ہے۔)

مادام: یہ تو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔ اتنے منحوس گلاب، اتنے بیمار داؤدی! شاید سستا خریدنے کے شوق میں انہیں صبح سے پہلے ہی لے آیا گیا ہے۔

(سولانژ اسے کوٹ اتارنے میں مدد دیتی ہے۔)

سولانژ: مادام بہت زیادہ سرد نہیں ہو رہی ہیں؟

مادام: ہاں، سولانژ، میں واقعی سرد ہو رہی ہوں۔ میں ساری رات راہ داریوں میں گھسٹتی رہی ہوں۔ میں یخ زدہ مُردوں اور پتھر جیسے چہروں کو دیکھتی پھری ہوں۔ مگر میں نے موسیو کی ایک جھلک دیکھ لی! میں نے انہیں ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ بس ایک مجسٹریٹ کی بیوی سے مُلاقات رہ گئی۔ کلیغ!

سولانژ: وہ مادام کی چائے تیار کر رہی ہے۔

مادام: میں چاہتی ہوں کہ وہ جلدی سے چائے لے آئے۔۔۔ مجھے چائے طلب کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے! موسیو بالکل تنہا ہوں گے، کسی چیز کے بغیر، کھانے کے بغیر، سگریٹوں کے بغیر۔۔۔

سولانژ: مگر موسیو وہاں دیر تک نہیں رہیں گے۔ فوراً پتا چل جائے گا کہ موسیو بےقصور ہیں۔

مادام: وہ قصوروار ہوں یا بےقصور، میں ان سے جدا نہیں رہوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ دیکھو سولانژ، ایسے ہی وقت تو کسی سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں بھی انہیں قُصوروار نہیں سمجھتی؛ مگر وہ ہوتے بھی تو میں ان کے جرم میں شریک ہوتی۔ میں ان کے ساتھ کالے پانی جاؤں گی، سائبیریا جاؤں گی۔

سولانژ: فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے اس سے زیادہ سنگین مقدمات میں لوگوں کو بَری ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ بوردو میں ایک مقدمہ تھا۔۔۔

مادام: کیا تم سماعتوں میں جاتی ہو؟ تم؟

سولانژ: میں جرائم کی خبریں پڑھتی ہوں۔ مقدمہ ایک آدمی پر تھا جو۔۔۔

مادام: تم موسیو کے مقدمے کا کسی اور سے موازنہ نہیں کر سکتیں! وہ انتہائی بچکانہ چوریوں کے الزام میں گرفتار ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ چھوٹ جائیں گے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس الٹے سیدھے قصّے کے بعد میں جان گئی ہوں کہ میں ان سے کتنی قریب ہوں۔ بےشک ان پر کوئی

سنگین الزام نہیں ہے، مگر الزام ہوتا بھی، سولانژ، تو مجھے ان کی صلیب اٹھانے میں خوشی ہوتی۔ میں ان کے ساتھ دربدر پھرتی، ایک جیل سے دوسری جیل میں جاتی، اور اگر چلنا ہی پڑ جاتا تو قیدیوں کی بستی تک ننگے پاؤں جاتی۔

سولانژ: قانون آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گا، صرف ڈاکوؤں کی بیویاں، یا ان کی بہنیں یا مائیں ان کے ساتھ جا سکتی ہیں۔

مادام: تم محض ایک ملزم کو ڈاکو کہہ رہی ہو؟ پھر میں زبردستی اپنا راستا بناؤں گی، محافظوں کو رِجھاؤں گی، اور سولانژ، میں انتہائی نڈر بن جاؤں گی، میں اپنے ہتھیار استعمال کروں گی--- تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟

سولانژ: مادام ایسے خیالات ذہن میں نہ آنے دیں۔ آپ آرام کریں۔

مادام: میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ تم مجھے بیمار سمجھ کر سلوک مت کرو۔ تم ہمیشہ میرے ناز اٹھانے کو تیار رہتی ہو، بس جیسے میں مر جانے والی ہوں۔ خدا کا شکر ہے میرے حواس سلامت ہیں۔ میں جنگ کے لیے تیار ہوں۔ (وہ سولانژ کی طرف دیکھتی ہے، اور یہ جان کر کہ اس کو اذیت پہنچائی ہے، مسکراہٹ کے ساتھ) چلو، اب ایسا منہ مت بناؤ۔ (اچانک شدت سے) صحیح کہہ رہی ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم اتنی اچھی بن جاتی ہو کہ مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم اپنی فرماں‌برداری سے میرا گلا گھونٹ دیتی ہو، مجھے کچل ڈالتی ہو۔ اور پھول، یہ یہاں پر کس جشن کی یاد میں رکھے گئے ہیں؟

سولانژ: کیا مادام سمجھتی ہیں کہ ہم میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟

مادام: نہیں، نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتی۔ بات صرف یہ ہے کہ میں پریشان ہوں۔ دیکھ نہیں رہی ہو میں کس حال میں ہوں۔

سولانژ: کیا مادام آج دن کے اخراجات کا حساب لیں گی؟

مادام: خوب وقت ڈھونڈا ہے! تم ضرور پاگل ہو۔ اس وقت میں حساب دیکھوں گی؟ کل دکھا دینا۔

سولانژ: (فر کے اوپری حصے کو الگ رکھتے ہوئے) اس کی سلائی اُدھڑ گئی ہے۔ کل اسے ضرور درست کرنے والے کے ہاں لے جاؤں گی۔

مادام: اگر تم مناسب سمجھو۔ اب تو شاید یہ کسی کام کا نہیں رہا۔ میں اپنا

وارڈروب چھوڑ رہی ہوں۔ ویسے بھی میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔

سولانژ: پھر وہی اداسی کی باتیں!

مادام: میں سوگ منانے کاارادہ کر رہی ہوں۔ تمھیں تعجب تو نہیں ہو گا میرے سوگ منانے پر؟ میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں جب موسیو قید میں ہیں۔ اگر تمھیں یہ گھر بہت اداس لگے تو۔۔۔

سولانژ: ہم کبھی مادام کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

مادام: مجھے معلوم ہے تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ سولانژ، تم مجھ سے ناخوش نہیں ہو۔

سولانژ: اوہ!

مادام: جب تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہوئی میں نے چاہا کہ تمھیں مل جائے۔ صرف میرے پرانے گاؤنوں سے تم دونوں شہزادیوں کی طرح ملبوس نظر آ سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ (وہ الماری کی طرف جاتی ہے اور اپنے لباس کو دیکھتی ہے۔) یہ میرے کس کام آئیں گے؟ میں نفاست اور اس کے لوازمات سے گزر چکی ہوں۔

(کلیغ چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوتی ہے۔)

کلیغ: چائے تیار ہے۔

مادام: پارٹی، ڈانس اور تھیٹر کو الوداع! اب تم دونوں ان سب کی وارث ہو گی۔

کلیغ: مادام اپنےآپ پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہیں۔ انھیں خود کو بکھرنے نہیں دینا چاہیے۔

سولانژ: چائے تیار ہے۔

مادام: رکھ دو۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ (وہ اپنے سرخ مخملی لباس ہاتھ پھیرتی ہے) میرا پیارا فیسی نیشن! (وہ اُسے اتارتی ہے اور اپنا ہاتھ اس پر پھیرتی ہے۔) یہ میرے لیے لان واں نے بنایا تھا، خاص طور پر میرے لیے۔ اب تم اسے لے سکتی ہو۔ یہ تمھارا ہے۔ (وہ اسے کلیغ کو دیتی ہے اور الماری کی تلاشی لیتی ہے۔)

کلیغ: میرا ہے؟

مادام: (اداسی سے مسکراتے ہوئے) ہاں۔ یہی کہا ہے میں نے۔

سولانژ: مادام بہت مہربان ہیں (کلیغ سے) تم مادام کا شکریہ ادا کرو۔ تمھیں بہت دنوں سے پسند تھا یہ۔
کلیغ: کتنا خوب صورت ہے۔ میں تو پہننے کی جرأت بھی نہیں کر سکوں گی۔
مادام: تم اس میں تبدیلی کرا سکتی ہو۔ اندر کافی مخمل ہے، آستینیں بن سکتی ہیں۔ اور تمھارے لیے سولانژ، میں تمھیں دینے جا رہی ہوں--- کیا دوں میں تمھیں؟ یہ کوٹ۔

(وہ سولانژ کو بہت عمدہ فر کا کوٹ دیتی ہے۔)

کلیغ: اوہ! فر کا کوٹ۔
سولانژ: (جذبات کی لہر میں) اوہ! مادام--- مادام بہت مہربان ہیں۔
مادام: نہیں نہیں، میرا شکریہ ادا مت کرو۔ کتنی خوشی ہوتی ہے لوگوں کو خوش دیکھ کر۔ اب میں کپڑے بدلنے جا رہی ہوں۔

(وہ ٹیلی فون کی طرف دیکھتی ہے۔)

ریسیور کو کس نے الگ کر دیا ہے؟
کلیغ: موسیو--- (اچانک خاموش ہو جاتی ہے۔)
مادام: (دم بخود) موسیو؟ (کلیغ خاموش ہے۔) تم کیا کہہ رہی ہو؟ بولتیں کیوں نہیں؟
سولانژ: (آہستہ سے، اور جیسے اپنےآپ پر جبر کر رہی ہو) موسیو نے فون کیا تھا۔
مادام: تم کیا کہہ رہی ہو؟ موسیو نے فون کیا تھا؟
سولانژ: ہم مادام کو حیرت زدہ کرنا چاہتے تھے۔ موسیو ضمانت پر رہا ہو گئے ہیں۔ وہ مادام کا بلبوکے بار میں انتظار کر رہے ہیں۔
مادام: (اٹھتے ہوے) اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں! فوراً ٹیکسی لے کر آؤ۔
سولانژ، مجھے فوراً ٹیکسی چاہیے۔ بس دوڑ کر جاؤ۔ (وہ سولانژ کو کمرے سے باہر دھکیل دیتی ہے۔) میرا کوٹ۔ تم دونوں پاگل ہو! اتنی دیر سے مجھے باتوں میں لگا رکھا ہے۔ تم واقعی پاگل ہو، یا پھر میں پاگل ہونے والی ہوں۔
(وہ اپنا فر کا کوٹ پہن لیتی ہے۔ کلیغ سے) کب فون کیا تھا انھوں نے؟
کلیغ: مادام کے آنے سے دس منٹ پہلے۔

مادام: تمھیں فوراً مجھے بتانا چاہیے تھا۔ اور یہ ٹھنڈی چائے۔۔۔ میں سولانژ کے آنے سے پہلے ہی ختم ہو جاؤں گی۔ انھوں نے اور کیا کہا تھا؟

کلیغ: میں آپ کو ابھی بتا چکی ہوں۔ وہ بالکل پُرسکون تھے۔

مادام: وہ ہمیشہ پُرسکون ہوتے ہیں، اگر انھیں موت کی سزا بھی سنا دی جائے تو وہ بالکل غیرمتعلق نظر آئیں گے۔ وہ عجیب شخص ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کیا کہا تھا؟

کلیغ: کچھ نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ جج نے انھیں رہا کر دیا ہے۔

مادام: کوئی پولیس ہیڈکوارٹر سے آدھی رات کے وقت کیسے رہا ہو سکتا ہے؟

کلیغ: کبھی کبھی اور زیادہ رات گئے بھی۔

مادام: اور رات گئے؟ تمھیں کیسے معلوم؟

کلیغ: میں جاسوسی کتابیں پڑھتی ہوں، مجھے ان چیزوں کے بارے میں معلوم ہے۔

مادام: (تعجب سے) تم جاسوسی کتابیں پڑھتی ہو؟ تم بڑی عجیب لڑکی ہو کلیغ۔ اس کو جلدی کرنی چاہیے۔

(وہ اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتی ہے۔)

بھول مت جانا، میرا کوٹ درست کروانا ہے۔

کلیغ: میں کل اسے فر والے کے پاس لے جاؤں گی۔

(طویل خاموشی۔)

مادام: حساب کہاں ہے؟ دن بھر کا حساب۔ مجھے دکھانا! اب میں دیکھ سکتی ہوں۔

کلیغ: حساب سولانژ رکھتی ہے۔

مادام: ٹھیک ہے، اس وقت میں پریشان ہوں، حساب کل دیکھ لوں گی (کلیغ کو گھورتے ہوئے) ذرا یہاں آنا۔ کیوں، تم نے میک اپ کر رکھا ہے! (ہنستے ہوئے) کیوں کلیغ، تم میک اپ کرتی رہتی ہو؟

کلیغ: (بہت گھبرائی ہوئی) مادام۔۔۔

مادام: اب جھوٹ مت بولو! ویسے بھی تمھیں پورا حق ہے۔ خوش رہا کرو، خوش۔ کس کے اعزاز میں ہو رہا ہے یہ میک اپ؟ کس کو دیوانہ کرنا ہے؟

کلیغ: تھوڑا سا پوڈر لگایا تھا۔

مادام: پوڈر کہاں، پورا میک آپ ہے- مگر کوئی حرج نہیں، تم ابھی جوان ہو- اسمارٹ بنو- (وہ ایک پھول کلیغ کے بالوں میں لگا دیتی ہے- اپنی گھڑی دیکھتی ہے-) کیا کر رہی ہے وہ؟ آدھی رات ہو گئی ہے، اب تک نہیں آئی-

کلیغ: اس وقت زیادہ ٹیکسیاں نہیں ملتیں-.وہ ٹیکسیوں کے اڈے پر گئی ہو گی-

مادام: مجھ سے تو وقت کی ڈور چھوٹ گئی ہے- میں خوشی سے دیوانی ہو رہی ہوں- موسیو اس وقت فون کر رہے ہیں- وہ آزاد ہیں-

کلیغ: مادام بیٹھنا چاہیں گی؟ میں چائے گرم کر کے لاتی ہوں-

(وہ جانے لگتی ہے-)

مادام: فکر مت کرو، مجھے چائے کی خواہش نہیں ہے- آج رات ہم شمپین پییں گے- تم سمجھ لینا آج رات ہم گھر نہیں آئیں گے-

کلیغ: واقعی! مگر ذرا سی چائے---

مادام (ہنستے ہوے) میں نہیں چاہتی کہ تم اور سولانژ ہمارے انتظار میں جاگتی رہ جاؤ- جاؤ اور اوپر جا کر سو رہو-

(اچانک الارم کلاک کو دیکھتی ہے)

مگر--- یہ الارم کلاک، یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کہاں سے آیا ہے یہ؟

کلیغ (بہت گھبراہٹ میں) الارم کلاک! یہ کچن کا کلاک ہے-

مادام: کچن کا؟ یہ کچن کا کلاک ہے؟ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا-

کلیغ: (الارم کلاک کو لے لیتی ہے-) یہ شیلف پر تھا- ہمیشہ وہیں ہوتا ہے-

مادام: (مسکراتے ہوے) ٹھیک ہے، کچن کے لیے تو میں اجنبی ہوں- وہ تمھاری سلطنت ہے- مگر تم اسے یہاں کیوں لائیں؟

کلیغ: سولانژ لائی تھی، صاف کرنے کے لیے- وہ بڑی گھڑی پر اعتبار کرنے کی جرأت نہیں کرتی-

مادام: بہت عجیب بات ہے-

(کلیغ کلاک لے کر باہر چلی جاتی ہے-)

بہت عجیب بات ہے-(اپنی گھڑی دیکھتی ہے-) وہ وقت برباد کر رہی ہے- ٹیکسیاں ہر نکڑ پر مل جاتی ہیں-

(ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ جاتی ہے، اپنےآپ کو آئینے میں دیکھتی ہے اور خود سے باتیں کرتی ہے-)

اور تمھارا کیا حال ہے، بےوقوف؟ کیا تم اس کا استقبال کرنے کے لیے خوب صورت رہ گئی ہو؟ جھریّاں نہیں پڑیں؟ بڑی طویل جدائی ہے، ہزاروں سال کی جدائی! میں یہاں اپنےآپ سے باتیں کیے جا رہی ہوں، خوشی سے وارفتہ ہو رہی ہوں--- اور سولانژ ابھی تک نہیں آئی- یہ اتنے سارے پھول! یہ لڑکیاں بھی میری پرستش کرتی ہیں-

(وہ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے بالائی حصے کو دیکھتی ہے اور پوڈر پھونک مار کر اڑاتی ہے-)

مگر انھوں نے ڈریسنگ ٹیبل کو نہیں جھاڑا- ان کا گھر سنبھالنا بھی عیاشی اور غلاظت کا شاہکار ہے-

(جیسے ہی وہ آخری جملہ ادا کرتی ہے، کلیغ کمرے میں پنجوں کے بل داخل ہوتی ہے- وہ مادام کے پیچھے چپکے سے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، مادام جو اسے آئینے میں دیکھ لیتی ہے-)

اوہ! میں پاگل پن کی باتیں کیے جا رہی ہوں کلیغ- میرا سر چکرا رہا ہے- مجھے معاف کرنا، آج کا دن کتنا وحشت ناک ہے-

کلیغ: کیا مادام ہمارے کام سے مطمئن نہیں؟

مادام: (مسکراتے ہوئے) اوہ! مجھے تنگ کرنا چھوڑو- آج جو مجھ پر گزری اس کے بعد مجھے تھوڑا سا بھکنے کا حق ہے--- سب سے پہلے خطوط کا مسئلہ ہے- سمجھ میں نہیں آتا کس نے انھیں پولیس کو بھیجا ہو گا- تمھیں تو کچھ نہیں معلوم ہو گا؟

کلیغ: کیا مادام کا خیال ہے---

مادام: میرا کچھ خیال نہیں- میں جاننا چاہتی ہوں، بس! میں سارا دن اندھوں کی طرح ٹٹولتی پھر رہی تھی- میں پولیس والوں کی طرح لگ رہی تھی جو جھاڑیوں میں کسی لڑکی کی لاش ڈھونڈنے نکلے ہوں-

کلیغ: اب وہ پریشانی دور ہو چکی ہے- موسیو بَری ہو گئے ہیں-

مادام: شکر ہے! مگر ابھی تک خطوط کا پتا نہیں چلا--- وہ کیا کر رہی ہے؟ ایک گھنٹا ہو گیا اسے گئے ہوئے! تم نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتایا کہ موسیو رہا ہو گئے ہیں؟ وہ ناراض ہو رہے ہوں گے-

کلیغ: ہم مادام کو خبر دیتے ہوئے ڈر رہے تھے، کہیں مادام کے دل پر سخت اثر نہ پڑے-

مادام: نہایت اعلیٰ خیال تھا تمھارا! تم مجھے خاموشی سے، پھولوں سے، مہربانیوں سے قتل کر رہی ہو۔ ایک دن میں پھولوں کے نیچے مُردہ پائی جاؤں گی--- کلیغ، تم میرے بالوں کی طرز کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ تمھیں پسند ہے؟

کلیغ: اگر اجازت ہو۔

مادام: اجازت ہو؟ اچھا اجازت ہے۔ مجھے تمھاری رائے پر بھروسا ہے۔ کیا خیال ہے تمھارا؟

کلیغ: اگر میں مشورہ دینے کی ہمت کروں، مادام کے بال پیشانی کے اُوپر زیادہ اچھے لگیں گے۔

مادام: تمھیں یقین ہے؟

کلیغ: اس طرح مادام کا چہرہ نازک لگے گا۔

مادام: اِس طرح؟ تم ٹھیک کہتی ہو۔ کلیغ، تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ تمھارا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔ تم بہترین چیزوں کے لیے پیدا ہوئی ہو۔

کلیغ: مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔

مادام: نہیں، میں جانتی ہوں۔ پھر بھی تم دوسروں سے زیادہ حساس ہو۔ مجھے پتا ہے، تمھیں ان کے ساتھ رہنے میں زیادہ مزہ نہیں آتا۔ خوش قسمتی ہے تمھاری، تم اپنی بہن کے ساتھ ہو۔ تمھارا ایک خاندان ہے۔ تھوڑی سی اَور خوش قسمتی سے تم---

کلیغ: اگر میں نے چاہا ہوتا---

مادام: مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ (کچھ سنتی ہے۔) سنا؟ (کھڑی ہو جاتی ہے) سنا؟ ٹیکسی کی آواز۔ سولانژ آ گئی۔ (وہ خود کو پھر آئینے میں دیکھتی ہے۔)

کلیغ: باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ مادام تھوڑی سی چائے ضرور پی لیں۔

مادام: (ہنستے ہوئے) تم مجھے اپنی چائے سے، اپنے پھولوں اور اپنے مشوروں سے قتل کرنا چاہتی ہو۔ اتنی تواضع مت کرو میری! میں نے کبھی اپنےآپ کو اتنا زندہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اوہ! بہترین ٹی سیٹ میں پیش کی ہوئی چائے۔ وہی بہترین سیٹ، اتنا تکلف! اتنی شستگی!

(وہ جانا چاہتی ہے، مگر کلیغ اس کے اور دروازے کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔)

کلیغ: (التجا کرتے ہوئے) مادام اسے ضرور پی لیں۔

(سولانژ جلدی سے داخل ہوتی ہے۔ وہ اپنی بہن کو ایک طرف دھکیل دیتی ہے اور مادام کی طرف مڑتی ہے۔)

مادام: ہاں!

سولانژ: (متعجب) مادام ابھی تک یہیں ہیں؟ میں نے ٹیکسی بہت تلاش کی۔ کوئی اس وقت آنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔

مادام: ٹیکسی مل گئی؟

سولانژ: ٹیکسی آ گئی ہے مادام! نیچے کھڑی ہے۔

مادام: تم اوپر جا کر سو رہو۔ اور صبح ہم بھی بس سوئیں گے اور سوئیں گے اور سوئیں گے۔ کلیغ--- اور، اور میرے جانے کے بعد دروازہ بند کر دینا، مگر چٹخنی لگانے کی ضرورت نہیں۔

(وہ چلی جاتی ہے۔ کلیغ اس کے پیچھے ہے۔ سولانژ اکیلی رہ جاتی ہے۔ کلیغ واپس آتی ہے۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔)

سولانژ: (طنزیہ) تم نے خوب کیا! مجھ پر ہنستی تھیں۔

کلیغ: بہت کوشش کی کہ اسے نہ بتاؤں، مگر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔

سولانژ: اس نے نہیں پی؟

(کلیغ نہیں میں سر ہلاتی ہے۔)

ظاہر ہے، یہی توقع رکھنی چاہیے تھی!

کلیغ: تم میری جگہ ہوتیں تو بہتر ہوتا۔

(وہ تھوڑی دیر کے لیے بےحرکت رہتی ہے اور پھر کچن کی طرف جانے لگتی ہے۔)

سولانژ: کہاں جا رہی ہو؟

کلیغ: (مڑے بغیر، تھکی ہوئی آواز میں) سونے جا رہی ہوں۔ (چلی جاتی ہے۔)

سولانژ: کلیغ!

(خاموشی۔)

کلیغ!

(وہ دروازے تک جاتی ہے اور اسے پکارتی ہے)

کلیغ، میں تمھیں بلا رہی ہوں!

کلیغ: (اسٹیج کے باہر) مجھے کوئی پروا نہیں۔

سولانژ: (سیدھے ہاتھ والے دروازے کی طرف منھ کر کے) یہاں آؤ۔ تم سن رہی ہو؟ یہاں آؤ۔

(کلیغ اپنا ایپرن کھولتی ہوئی آتی ہے۔)

کلیغ: (بہت تھکی ہوئی) کیا چاہتی ہو؟ میری غلطی تھی؟ "چا" تیار تھی، میں نے گولیاں ڈال دی تھیں۔ اس نے پی ہی نہیں۔

سولانژ: اور اب تم یہیں بیٹھی رہنا چاہتی ہو؟ (وہ اپنی بہن کو سختی سے گھورتی ہے۔) وہ دونوں کل لوٹ آئیں گے، نشے میں چُور، اور نفرت سے بھرے، جیسے کچھ فتح کر کے آئے ہوں۔ انہیں معلوم ہو جائے گا خط کس نے لکھے تھے۔ اوہ! مجھے نفرت ہے!

(کلیغ اپنے کاندھے جھٹکتی ہے۔)

مجھے اس سے نفرت ہے۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ اور تم، تم آرام سے کھڑی ہو! تم نے دیکھا کیسی چھک رہی تھی وہ! مجھے اس کی خوشی سے کراہت آتی ہے۔ اس کی خوشیاں ہماری ذلتوں پر پلتی ہیں۔ اس کا لباس۔۔۔

(وہ سرخ مخمل کے لباس کو ٹھوکر لگاتی ہے)

اس کے فر۔۔۔ آہ! اس نے اپنا فر واپس لے لیا! اور تم آرام سے کھڑی ہو! تم چیختیں کیوں نہیں؟ مر تو نہیں گئی ہو؟

کلیغ: پتا نہیں تم کیا چاہتی ہو۔ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ تم اتنی جلدی آ گئی تھیں۔

سولانژ: وہ نکل گئی، اور تم آرام سے کھڑی ہو۔

کلیغ: تم کیا چاہتی ہو؟ تماشا بنایا جائے؟ (وہ سولانژ کے منہ پر چیختی ہے، سولانژ بےحرکت رہتی ہے۔) تم تماشا بنانا چاہتی ہو؟ جواب دو۔ ہمارے پاس وقت ہے، ساری رات پڑی ہے۔

سولانژ: (بہت پُرسکون لہجے میں) ہمیں اس کو جاری رکھنا چاہیے۔

کلیغ: جلدی کیا ہے، ہم آرام سے اپنا کام کریں گے۔

(وہ اپنا ایپرن کھولتی ہے۔)

سولانژ: ایپرن پہنے رہو۔ اب تمھاری باری ہے۔

کلیغ: اس سے فرق نہیں پڑتا۔

سولانژ: اب میری باری ہے مادام بننے کی۔

کلیغ: ایپرن لے لو۔

سولانژ: مگر کلیغ۔۔۔

کلیغ (سادگی سے) میری عادت ہے! یہ رہا۔ (وہ نزاکت سے ایپرن سولانژ کو دیتی ہے۔) واقعی میں نے بہت زیادہ پوڈر لگا رکھا ہے۔

سولانژ: پوڈر! کچھ پوڈر لگا ہوا ہے! مگر تم نے صرف پوڈر نہیں لگایا ہے، پورا میک اپ کیا ہے۔

سولانژ: وہ بات ختم ہو چکی۔ (وہ ایپرن کو زور سے پکڑ لیتی ہے۔) اس کو پہننے کی مجبوری! مگر میں سچ مچ کی خادمہ بننا چاہتی ہوں۔ (ایپرن کی ڈوری باندھتی ہے۔) روشنی بند کر دو۔

کلیغ (ڈرتے ہوے) تم--- تم چاہتی ہو کہ--- اندھیرے میں چیزوں کو ٹھیک کیا جائے؟

سولانژ: جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو!

(وہ روشنی بند کر دیتی ہے۔ کمرہ نیم تاریکی میں ہے۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں اور حرکت کیے بغیر بات کرتی ہیں۔)

کلیغ: ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا چاہیے سولانژ۔ فرض کرو وہ واپس آ جائے۔ ممکن ہے مادام کچھ بھول گئی ہو۔ ایسے موقع پر آدمی کچھ نہ کچھ بھول جایا کرتا ہے۔

سولانژ: اناڑی۔

کلیغ: (آہستہ سے کہتی ہے) اتنی جلدی میں نکلنا--- یہ کوئی چال تو نہیں؟ مادام کو شبہ ہو گیا ہے۔

سولانژ: (اپنے کاندھے اچکاتے ہوے) کیسا شبہ، مثال کے طور پر؟

کلیغ: وہ ہوشیار ہو گئی ہے۔ ہماری نگرانی کی جا رہی ہے۔

سولانژ: کس بات سے ہوشیار ہو گئی ہے؟ ہم شبے سے بالاتر ہیں۔

کلیغ: (وقت حاصل کرنا چاہتی ہے۔) تم میری بات سن نہیں رہی ہو سولانژ۔ میں یقین سے کہتی ہوں، میں نے کچھ محسوس کیا ہے۔ ہماری حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ وہ اچانک آ جائے گی۔ وہ اپنا رومال بھول گئی ہو گی، یا شاید اپنے دستانے۔ (سولانژ اپنے کاندھے اچکاتی ہے۔) یا اپنی میک اپ کی ڈبیا۔ میں یہاں کچھ محسوس کر رہی ہوں سولانژ! اس کمرے میں کوئی چیز ہے--- جو ہماری حرکات کو محفوظ کر رہی ہے، انھیں دوبارہ پیش کر سکتی ہے--- یاد ہے مادام نے ہمیں چٹخنی لگانے کو منع کیا ہے؟

سولانژ: تم بغیر سمجھے بات کر رہی ہو۔

کلیغ: نہیں، میں سمجھ رہی ہوں۔ ذرا رُکو، یہ بڑی اہم بات ہے، فرض کرو وہ آ جائے؟

سولانژ: یہ اس کے لیے بہت برا ہو گا۔

کلیغ: تم عجیب ہوتی جا رہی ہو سولانژ! تمھارے پاس ہر چیز کا جواب موجود ہے۔ کم از کم۔۔۔

سولانژ: کیا؟

کلیغ: دعا مانگنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سولانژ: کیا تم خدا کو درمیان میں لانا چاہتی ہو؟

کلیغ: مگر ہم مقدس۔۔۔

سولانژ: مادرِ خداوند کو اس تقریب میں شامل کرنا چاہتی ہو؟ واقعی تم اس سے کہیں زیادہ ڈھیٹ ہو جتنا میں سمجھتی تھی۔ تمھیں ذرا بھی شرم نہیں۔

کلیغ: آہستہ، سولانژ، دیواریں بہت پتلی ہیں۔

سولانژ: (کم بلند آواز میں) تم پاگل ہو رہی ہو کلیغ! صرف خدا ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے آخری بار یہ ہمیں اُسی کے لیے کھیلنا ہے، لیکن ہمیں اُس کو پہلے سے مطلع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں آخر تک کھیلنا ہو گا۔

کلیغ: اتنے زور سے نہیں۔

سولانژ: دیواریں اُس کے کان ہیں۔

کلیغ: تو پھر میں سفید لباس پہن لیتی ہوں۔

سولانژ: اگر تمھارا دل چاہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر جلدی کرو۔ ہمیں بےکار کی تمہید چھوڑ کر اصل قصہ شروع کرنا چاہیے۔ ہم نے بہت دن ہوے جھوٹ اور بےایمانی چھوڑ دی ہے۔ براہِ راست کھیل شروع کرو۔ جلدی کرو! جلدی! میں اس شرم اور بےعزتی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے پروا نہیں اگر دنیا ہماری باتیں سنتی ہے، ہم پر ہنستی ہے، اپنے کندھے اچکاتی ہے، اور مجھے دیوانہ اور حاسد کہتی ہے۔

(اس مکالمے کے دوران کلیغ نے سفید لباس نکال لیا ہے اور اسکرین کے پیچھے جا کر اسے اپنے سیاہ لباس کے اوپر پہن لیا ہے جس کی سیاہ آستینیں نظر آ رہی ہیں۔)

کلیغ: (سفید لباس میں آتے ہی تحکمانہ آواز میں) شروع کرو!

سولانژ: (کینہ کی حالت میں) تم بہت خوب صورت ہو۔

کلیغ: اسے چھوڑو- تم نے ابتدائی حصہ چھوڑنے کو کہا تھا- میری توہین شروع کرو-

سولانژ: میں تمھاری توہین نہیں کر سکوں گی- میری آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں-

کلیغ: میں کہتی ہوں توہین! اسے اپنے بند توڑ کر آنے دو، مجھے اپنے سیلاب میں غرق کرنے دو، کیوں‌کہ تم جانتی ہو، مجھے نوکروں سے سخت نفرت ہے- گندے، مکروہ! میں ان سے نفرت کرتی ہوں- وہ انسانوں کی نسل سے نہیں ہیں-

سولانژ: بولتی رہو- (خاموشی- کلیغ کھانستی ہے-) جاری رکھو-

کلیغ: مجھے پتا ہے وہ بھی ایک ضرورت ہیں، جیسے قبر کھودنے والے، مُردے ڈھونے والے اور پولیس کے آدمی ضروری ہیں- مگر اس کے باوجود وہ سخت گندے لوگ ہیں-

سولانژ: بولے جاؤ-

کلیغ: یہ تمھارے دہشت زدہ مجرم چہرے، تمھاری جھریوں‌دار کلائیاں، تمھارے بدوضع کپڑے، تمھارے ضائع شدہ جسم جو صرف ہماری اُترن کے مستحق ہیں- تم ہمارے مسخ آئینے ہو، ہماری گھناؤنی فصد، ہماری شرمندگی، ہماری راہ کے پتھر-

سولانژ: بولتی رہو-

کلیغ: جلدی کرو، میں اسے اور جاری نہیں رکھ سکتی- تم--- تم--- میرے خدا، مجھے کچھ اور سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میرا دماغ شل ہو گیا ہے- میرے پاس توہین ختم ہو گئی ہے- کلیغ، تم نے مجھے تھکا مارا-

سولانژ: خاموش! اب میری باری ہے- مادام نے بہت نازنخرے کر لیے- ان کے عاشق، ان کا دودھ والا---

کلیغ: سولانژ---

سولانژ: خاموش! ان کا دودھ والا، ان کا صبح کا پیغامبر، ان کا دلکش عاشق- یہ سب بہت ہو چکا-

(وہ ایک گھڑسواری کا چابک اٹھاتی ہے-)

کلیغ: تم کیا کر رہی ہو؟

سولانژ: (سنجیدگی سے) بہاؤ کو روک رہی ہوں۔ گھٹنوں کے بل جھک جاؤ۔
کلیغ: سولانژ۔
سولانژ: جھکو! (کلیغ ہچکچاتی اور جھک جاتی ہے۔) آہ! آہ! تم کتنی خوب صورت تھیں، کتنی اچھی طرح تم اپنے بےبہا بازوؤں کو گردش دیتی تھیں! تمھارے آنسو، تمھاری آنکھوں سے تمھارے پیارے چہرے پر ڈھلکتی ہوئی پھولوں کی پتیاں۔ آہ! آہ! اور جھکو۔ (کلیغ حرکت نہیں کرتی۔) نیچے! (سولانژ اسے مارتی ہے۔) نیچے جھکو! (کلیغ لیٹ جاتی ہے۔) آہ! زندگی کا مزہ۔ میں کہتی ہوں، کیڑے کی طرح رینگو، رینگو! اور تم کشتیوں پر سمندر کے پار اپنے جلاوطن عاشق کی مدد اور دلجوئی کو جانا چاہتی تھیں؟ پھر سے دیکھنا اپنےآپ کو! یہ کردار صرف اس کے لیے ہے جو حسینوں میں حسین ہو۔ پہرےدار تم پر ٹھٹھا ماریں گے۔ لوگ تمھاری طرف انگلیاں اٹھائیں گے۔ تمھارا عاشق اپنی گردن شرم سے جھکا لے گا۔ اور تم اتنی مضبوط ہو؟ یہ بیگ اٹھا کر چل سکتی ہو؟ اور اتنی چاق و چوبند ہو، مادام، کہ اپنے پیروں پر چل سکو؟ فکر مت کرو۔ مجھے جلن نہیں ہو رہی ہے۔ جہاں میں جا رہی ہوں وہاں اس چور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ نہیں مادام، میں خود ہی چور اور اس کی زرخرید پرچھائیں ہوں۔ میں اکیلے روشن ساحلوں کی طرف بڑھ رہی ہوں۔
کلیغ: میں اسے کھو رہی ہوں۔
سولانژ: کیا میں تمھارے لیے کافی نہیں ہوں؟
کلیغ: سولانژ، میں ڈوب رہی ہوں۔
سولانژ: ڈوب جاؤ! مگر پھر ابھر آنا۔ میں جانتی ہوں میری آخری تقدیر کیا ہے۔ میں پناہ تک پہنچ گئی ہوں۔ میں فیاضی دکھا سکتی ہوں۔ (لمبا سانس لیتی ہے۔) کھڑی ہو جاؤ! تم کھڑے ہو کر شادی کرو گی! آہ! آہ! قالین پر ایک مرد کے قدموں میں آپ جھک رہی ہیں۔ کیسی افسوس ناک اور حقیر حرکت ہے! اصل کارنامہ خوب صورتی میں ختم ہونا ہے۔ تم کس طرح کھڑی ہو گی؟
کلیغ: (آہستہ اور بےڈھنگے پن سے کھڑے ہوتے ہوئے) تم مجھے قتل کر رہی ہو۔
سولانژ: (طنزیہ) خبردار ہو جاؤ! اپنی حرکت کا خیال رکھو!
کلیغ: (اپنے قدموں پر) ہم اپنے حواس سے باہر ہیں۔ ہمیں اپنے بستر پر چلے

جانا چاہیے۔ میرا گلا۔۔۔

سولانژ: (اس کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے) مادام کا گلا بہت دل کش ہے۔ بالکل کسی ملکہ کا گلا لگتا ہے (کلیغ کچن کے دروازے کی طرف جاتی ہے۔) کسی فاختہ کا گلا۔ آؤ، میری نایاب فاختہ!

کلیغ: (اپنےآپ کو اور پیچھے لے جاتی ہے، اپنے ہاتھ اپنے گلے پر رکھتی ہے جیسے اس کو بچا رہی ہو۔) بہت دیر ہو چکی ہے۔

سولانژ: کوئی دیر نہیں ہوئی۔

کلیغ: مادام!

سولانژ: موسیو کے ساتھ شمپین پی رہی ہیں! موسیو مر کر زندہ ہوے ہیں۔

کلیغ: وہ کسی وقت بھی آ جائے گی۔ مجھے جانے دو۔

سولانژ: فکر مت کرو! وہ رقص کر رہی ہے، وہ رقص کر رہی ہے، وہ اعلیٰ شرابیں پی رہی ہے۔

کلیغ: ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے، سولانژ! میں کہہ رہی ہوں ہم خطرے میں ہیں۔

سولانژ: مقدس کمرے میں جاؤ۔ (کچن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔) اندر جا تمھیں فرش کی صفائی ختم کرنی ہے۔

کلیغ: (کھوکھلی آواز میں چیختی ہے) مدد!

سولانژ: چیخو مت! اب کوئی فائدہ نہیں۔ موت آ پہنچی ہے، اور تمھیں دبےپاؤں دبوچ رہی ہے۔ چیخو مت۔ میں نے تمھیں اس طرح رکھا ہے جیسے بلی کے بچوں کو ڈبونے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ میں، ہاں، میں نے اپنے پیٹ کو پِنوں سے زخمی کیا ہے تاکہ ان سارے بچوں کو جو میں نے نالی میں بہا دیے، قتل کر سکوں اور تمھیں زندہ رکھ سکوں۔

کلیغ: (کمرے میں دوڑتے ہوے) سولانژ، سولانژ، ہوش میں آؤ۔

سولانژ: (اس کے پیچھے دوڑتے ہوے) ہوش میں!

کلیغ: (بھدی آواز میں) مدد!

سولانژ: چیخنا بند کرو! کوئی تمھاری آواز نہیں سن رہا ہے!

کلیغ: سولانژ۔۔۔

سولانژ: ہر شخص سن رہا ہے، مگر کوئی نہیں سنے گا۔

کلیغ: میں بیمار ہوں۔

سولانژ: وہاں تمھارا خیال رکھا جائے گا۔

کلیغ: میں بیمار ہوں--- میں--- میں بیمار پڑنے والی ہوں---

(ایسا معلوم ہوتا ہے اس کی آواز گھونٹی جا رہی ہے۔)

سولانژ: (اس کی طرف آتے ہوئے ہمدردی سے) سچ! تم سچ مچ بیمار ہو! کلیغ، تمھاری طبیعت واقعی خراب ہو رہی ہے؟

کلیغ: میں بیمار ہوں، میں---

سولانژ: نہیں، یہاں پر نہیں کلیغ۔ برداشت کرو۔ (وہ اسے سہارا دیتی ہے۔) یہاں پر نہیں۔ آؤ، میرا سہارا لے لو۔ وہاں، آہستہ آہستہ چلو۔ وہاں پر ہم ٹھیک رہیں گے، وہاں، اپنی پھولوں بھری سلطنت میں۔ میرے پاس تمام تکلیفوں کو ختم کرنے کے لیے آزمودہ نسخہ ہے۔

(وہ کچن کے دروازے سے چلی جاتی ہیں۔ چند سیکنڈ تک اسٹیج خالی رہتا ہے۔ ہوا کا جھونکا کھڑکی کھول دیتا ہے۔ دائیں طرف سے سولانژ داخل ہوتی ہے، وہ اپنا مختصر سیاہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ پورے سین میں وہ خیالی کرداروں سے خطاب کرتی ہوئی محسوس ہو گی۔)

سولانژ: مادام--- آخرکار مادام مر گئیں! کچن کے فرش پر، برتن دھونے کے دستانوں سے گلا گھٹ کر۔ کیا؟ اوہ، مادام بیٹھی رہیں۔ مادام مجھے مادموازیل سولانژ کہہ کر بلا سکتی ہیں۔ یہ میری ہی حرکت سے ہوا ہے۔ مادام اور موسیو مجھے مادموازیل سولانژ لمغسیے پکاریں گے۔ مادام کو یہ سیاہ لباس اتار دینا چاہیے تھا۔ کتنا مضحکہ خیز ہے! (وہ مادام کی نقل اتارتی ہے) میں اپنی خادمہ کے لیے ماتمی لباس پہننے پر مجبور کر دی گئی ہوں! جب میں قبرستان سے نکل رہی تھی، آس پاس کے تمام نوکر میرے سامنے سے یوں گزرے جیسے میں ان کے خاندان کی فرد ہوں۔ موت بھی مذاق کو تلخ انجام تک لے جائے گی--- کیا؟ اوہ! مادام کو میرے لیے افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مادام کے برابر ہوں اور اپنا سر اونچا رکھتی ہوں۔ آہ! اور کچھ چیزوں کا موسیو کو احساس نہیں ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ وہ میری تابعداری کرتے تھے۔ (ہنستی ہے) آہ! آہ! موسیو ننھے سے بچے تھے--- نہیں انسپکٹر، نہیں۔ میں بول کر نہیں دوں گی۔ میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گی۔ میں قتل میں اپنی اور موسیو کی سازباز کے بارے میں کچھ نہیں بولوں

گی--- لباس؟ اوہ؟ مادام انھیں اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔ میری بہن کے اور میرے پاس اپنے کپڑے ہیں، وہ جو ہم چپکے سے رات کو پہنتے تھے۔ اب میرے پاس اپنا لباس ہے اور میں تمھارے برابر ہوں۔ میں مجرموں کا سرخ لباس پہنتی ہوں۔ موسیو مجھ پر ہنس رہے ہیں؟ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ موسیو سمجھتے ہیں میں پاگل ہوں۔ وہ چاہتے ہیں خادماؤں کو وہ ادائیں نہیں دکھانی چاہییں جو مادام کے لیے مخصوص ہیں۔ موسیو مجھے واقعی معاف کر دیں گے؟ موسیو رحم دلی کی جان ہیں۔ وہ عظمت میں میرا مقابلہ کریں گے۔ مگر میں نے خطرناک ترین بلندیوں کو عبور کر لیا ہے۔ مادام اب میری تنہائی کو ملاحظہ فرمائیے! ہاں، میں اکیلی ہوں اور بہت ڈراونی۔ میں سخت باتیں کہہ سکتی ہوں، مگر میں نرم دل رہوں گی--- مادام اپنے خوف پر غالب آ جائیں گی۔ وہ اچھی طرح اس پر غالب آ جائیں گی۔ ان کے پاس ان کے پھول اور عطر اور گاؤن اور زیورات اور عاشق ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میرے پاس میری بہن ہے۔ ہاں، میں ان کا چیزوں کا ذکر کرنے کی جرأت رکھتی ہوں۔ میں ذکر کروں گی مادام، کوئی بات ایسی نہیں جس کی جرأت میرے پاس نہ ہو۔ اور کون مجھے بولنے سے روک سکتا ہے؟ کون اتنا جرأت مند ہے کہ مجھ سے کہے: "میری پیاری ننھی سی جان؟" میں ایک خادمہ ہوں، ٹھیک ہے۔ میں نے وہی حرکتیں کیں جو ایک خادمہ کو کرنی چاہییں۔ میں مادام کو دیکھ کر مسکراتی رہی۔ میں ان کا بستر ٹھیک کرنے کو جھکتی رہی، فرش دھونے کو جھکتی رہی، ترکاریاں چھیلنے کو جھکتی رہی، دروازے سے سن گن لینے کو جھکتی رہی، اپنی آنکھیں چابی کے سوراخ سے چپکا دینے کو جھکتی رہی۔ مگر اب میں تن کر کھڑی ہوں۔ اور خوب مضبوطی سے کھڑی ہوں۔ میں نے گلا گھونٹا ہے۔ میں، مادموازیل سولانژ، وہی جس نے اپنی بہن کا گلا گھونٹا ہے--- کیا؟ میں چپ رہوں؟ مادام بہت نازک ہیں، سچ مچ! مگر مجھے مادام پر ترس آتا ہے۔ مجھے مادام کے سفید رنگ، ان کی ریشمی جلد، ان کے نازک کانوں اور ان کی نرم کلائی پر ترس آتا ہے--- کیا؟ میں ایک کالا کوّا ہوں؟ --- ہا! میرے منصف اس کا فیصلہ کریں گے۔ میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔ کلیئر؟ واقعی وہ بےچاری مادام کی بہت گرویدہ تھی--- اور آپ کے لباس! اور آپ کا وہ سفید لباس، وہی، جسے پہننے کی میں

نےاسے ممانعت کر دی تھی، وہی جو مادام نے آپرا بال والی رات کو پہنا تھا، اُسی رات جب مادام نے اس بےچاری کا مذاق اڑایا تھا کیوں‌کہ وہ کچن میں بیٹھی گیری کوپر کی تصویر سے مسحور ہو رہی تھی--- مادام کو یاد ہو گا! مادام کو یاد ہو گا، کس لطیف طنز سے، کس پُروقار مامتا سے انھوں نے وہ رسالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ مادام یہ بھی نہیں بھولی ہوں گی کہ انھوں نے اسے کلارینٹ کہہ کر پکارا تھا۔ جس پر ہنستے ہنستے موسیو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے--- کیا؟ میں کون ہوں؟ میں خادمہ پن کی ہولناک بدروح ہوں! نہیں انسپکٹر، میں ان لوگوں کی موجودگی میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر مالک لوگ ان تاریکیوں کو چیر کر دیکھ سکتے جہاں نوکر رہتے ہیں۔ وہ ہماری تاریکی ہے، ہماری اپنی! (وہ ایک سگریٹ جلاتی ہے اور پھوہڑپن سے کش لیتی ہے۔ کش سے اسے کھانسی آ جاتی ہے۔) تمھیں یا کسی اور کو کچھ بھی نہیں بتایا جائے گا۔ صرف یہ جان لو کہ اس بار سولانژ یہ کام کر گزری--- تم اسے سرخ لباس میں دیکھ رہے ہو۔ وہ باہر جا رہی ہے۔

(وہ کھڑکی تک جاتی ہے، اسے کھولتی ہے، اور بالکنی میں چلی جاتی ہے۔ چہرہ رات کی طرف اور پشت تماشائیوں کی طرف کیے، وہ یہ تقریر کرتی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا پردوں کو چھیڑ رہی ہے۔)

وہ باہر جا رہی ہے؛ عظیم سیڑھیوں سے اتر رہی ہے۔ پولیس اس کے ساتھ ہے۔ بالکنی پر آ جاؤ، اس کو جھوٹے شرمساروں کے درمیان سے جاتا ہوا دیکھو۔ ابھی دوپہر ہے۔ وہ نو پاؤنڈ کی ٹارچ لیے جا رہی ہے۔ جلاد اس کے بہت ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ اس کے کان میں محبت بھری باتیں کہہ رہا ہے۔ کلیغ! جلاد میرے قریب ہے۔ اب اپنا ہاتھ میری کمر سے ہٹاؤ۔ وہ مجھے چومنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے چھوڑو۔ آہ! آہ! (وہ ہنستی ہے۔) جلاد میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ وہ محلے کے تمام نوکروں کے جلوس میں لے جائی جائے گی، ان تمام نوکروں کے جلوس میں جو کلیغ کے جنازے میں شامل تھے۔ وہ سب اپنے اپنے تاج، پھول، علم اور جھنڈے لیے ہوں گے۔ وہ گھنٹیاں بجائیں گے۔ جنازہ اپنی شان کا مظاہرہ کرے گا۔ کتنا خوب صورت ہے یہ سب کچھ۔ سب سے پہلے خانساماں آتے ہیں، پوری وردی میں، مگر انھوں نے ریشمی پٹیاں اتار دی ہیں۔ وہ اپنے تاج پہنے ہوئے ہیں۔ پھر دربان آتے ہیں۔ پھر اردلی

برجس اور سفید موزے میں آتے ہیں- وہ اپنے تاج پہنے ہوے ہیں- پھر بیرے آتے ہیں اور پھر خادمائیں ہمارے رنگ کا لباس پہنے ہوے، پھر قلی اور پھر آسمان سے آیا ہوا طائفہ- میں ان سب کے آگے ہوں- جلاد مجھے لوری دے رہا ہے- میری تعریف ہو رہی ہے- میں زرد ہو چکی ہوں اور مرنے والی ہوں- (وہ کمرے کی طرف مڑتی ہے-) اور کون سے پھول! انھوں نے اس کا جنازہ کتنا خوب صورت نکالا- اوہ! کلیغ، بےچاری ننھی کلیغ! (رو پڑتی ہے اور کرسی پر گر جاتی ہے-) کیا؟ (اٹھتی ہے-) اب کچھ حاصل نہیں، مادام، میں پولیس کے کہنے پر عمل کر رہی ہوں- صرف وہی مجھے سمجھ سکتی ہے- وہ بھی اچھوتوں کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے، وہی دنیا جس کو آپ چِمٹے سے چھوتی ہیں-

(تماشائیوں کو نظر آتے ہوے، کلیغ آخری چند لمحات میں، اپنی کہنی کچن کے دروازے سے ٹِکائے کھڑی ہے اور اپنی بہن کی باتیں سن رہی ہے-)

اب ہم مادموازیل سولانژ لمغسیے ہیں، لمغسیے خاتون- مشہورِ زمانہ مجرم- اور سب سے بڑھ کر موسیو کو پریشان نہیں ہونا چاہیے- میں خادمہ نہیں ہوں- میں ایک معزز ہستی ہوں- (وہ اپنے کندھے اچکاتی ہے-) نہیں، نہیں، ایک لفظ بھی نہ کہیں، میرے عزیز! آہ، مادام فراموش نہیں کر پاتیں کہ میں نے ان کے لیے کیا کِیا--- نہیں، نہیں، انھیں میری شدید الفت کبھی نہیں بھولے گی-

(اس دوران کلیغ بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے- وہ سفید لباس پہنے ہوے ہے-)

اور میری تنبیہ کے بعد بھی مادام اپارٹمنٹ کے سامنے گشت کرنے سے باز نہیں آئیں- اب وہ مہربانی کر کے بیٹھ جائیں اور میری بات سنیں--- (کلیغ سے) کلیغ---

کلیغ: (شکایت کرتے ہوے، مادام کے لہجے میں) تم بہت زیادہ باتیں کرتی ہو، بہت زیادہ! کھڑکی بند کر دو- (سولانژ کھڑکی بند کرتی ہے-) پردے گرا دو- شاباش، کلیغ-

سولانژ: بہت دیر ہو گئی- سب لوگ سو چکے ہیں- ہم ایک احمقانہ کھیل کھیل رہے ہیں-

کلیغ: (اپنے ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کرتی ہے-) کلیغ، مجھے چائے کا ایک کپ دینا-

سولانژ: مگر۔۔۔

کلیغ: میں نے کہا نا، مجھے چائے کا کپ دینا۔

سولانژ: تھکن سے ہماری جان نکل چکی ہے۔ ہمیں اب ختم کرنا چاہیے۔

(وہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

کلیغ: آہ، ہرگز نہیں! بےچاری خادمہ، تم سمجھتی ہو کہ تم اس سے اتنی آسانی سے نکل جاؤ گی؟ ہوا کو سازش میں شریک کرنا، رات کو اپنے جرم کا ساتھی بنانا بہت آسان ہے۔ سولانژ، تم مجھے اپنے اندر زندہ رکھ سکتی ہو۔ اچھا اب میری بات غور سے سنو۔

سولانژ: کلیغ۔۔۔

کلیغ: جیسا میں کہہ رہی ہوں کرو۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے پہل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تمھارا کام مجھے میرے ارادے پر قائم رکھنا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سولانژ: اس سے زیادہ تم کیا چاہتی ہو؟ ہم اب ختم ہی کرنے والے ہیں۔

کلیغ: ہم بالکل ابتدا میں ہیں۔

سولانژ: وہ آتے ہوں گے۔

کلیغ: انھیں بھول جاؤ۔ ہم دنیا میں اکیلے ہیں۔ اس قربان گاہ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے جہاں دو خادماؤں میں سے ایک اپنےآپ کو آگ لگا کر مرنے والی ہے۔

سولانژ: مگر؟

کلیغ: خاموش رہو۔ یہ تمھاری ذمےداری ہے، صرف تمھاری، کہ ہم دونوں کو زندہ رکھے رہو۔ تمھیں بہت مضبوط ہونا ہو گا۔ قیدخانے میں کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، چپکے سے۔

سولانژ: میں کبھی بھی ایسا نہیں۔۔۔

کلیغ: پلیز، سیدھی کھڑی ہو۔ تن کر سیدھی، سولانژ! کلیغ! میری جان، سیدھی کھڑی ہو۔ بالکل سیدھی، اپنےآپ کو ٹوٹنے مت دو۔

سولانژ: تم مجھے کچل رہی ہو۔

کلیغ: ایک عَلم اٹھاؤ، کلیغ، اور تن کر کھڑی ہو جاؤ۔ میں تمھیں اپنی نمائندگی کا حکم دیتی ہوں۔

سولانژ: میں بہت سخت محنت کر رہی تھی۔ میں تھک چکی ہوں۔
کلیغ: دنیا میں میری نمائندگی کے لیے (وہ اپنی بہن کو اٹھانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کو اپنے پیروں پر بٹھاتی ہے۔) میری جان! سیدھی کھڑی ہو۔
سولانژ: پلیز، میں تم سے التجا کرتی ہوں۔
کلیغ: (تحکمانہ انداز میں) میں تم سے التجا کرتی ہوں، سیدھی کھڑی ہو۔ باوقار طریقے سے، کلیغ، اچھے بچوں کی طرح۔ اپنے پنجوں پر زور دے کر۔۔۔ (وہ اس کو کلائی سے پکڑتی اور کرسی سے اٹھا دیتی ہے۔) اپنے پنجوں پر کھڑی ہو جاؤ۔ اب، اٹھو، اٹھو۔
سولانژ: تمھیں خطرے کا احساس نہیں۔
کلیغ: مگر سولانژ، تم لافانی ہو۔ جو میں کہوں وہ دہراؤ۔
سولانژ: بولو، مگر زور سے نہیں۔
کلیغ: (میکانیکی انداز میں) مادام ضرور اپنی چائے نوش کریں گی۔
سولانژ: (سختی سے) نہیں، میں نہیں بولوں گی۔
کلیغ: (اس کو کلائی سے پکڑ کر) کتیا، بول، مادام ضرور اپنی چائے نوش کریں گی۔
سولانژ: میں ابھی۔۔۔
کلیغ: (زیادہ سختی سے) مادام اپنی چائے نوش کریں گی۔
سولانژ: مادام اپنی چائے نوش کریں گی۔
کلیغ: کیوں کہ انھیں ضرور سو جانا چاہیے۔
سولانژ: کیوں کہ انھیں ضرور سو جانا چاہیے۔
کلیغ: اور ضرور جاگتے رہنا چاہیے۔
سولانژ: اور ضرور جاگتے رہنا چاہیے۔
کلیغ: (مادام کے بستر پر لیٹ جاتی ہے) اب دخل مت دینا۔ میں پھر کہتی ہوں۔ تم سن رہی ہو؟ تم میری بات مان رہی ہو؟ (سولانژ ہاں میں سر ہلاتی ہے۔) میں پھر کہتی ہوں۔ میری چائے!
سولانژ: (ہچکچاتے ہوے) مگر۔۔۔
کلیغ: میں کہتی ہوں، میری چائے۔
سولانژ: مگر مادام۔۔۔

کلیغ: اچھا، بولے جاؤ۔

سولانژ: مگر مادام، چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

کلیغ: میں پھر بھی پیوں گی۔ مجھے پینے دو۔

(سولانژ ٹرے لاتی ہے۔)

اور تم نے اسے بہترین سیٹ، سب سے قیمتی سیٹ میں پیش کیا ہے۔

(وہ کپ اٹھاتی ہے اور پیتی ہے، جب کہ سولانژ، تماشائیوں کی طرف رخ کر کے، ساکت کھڑی ہے، اس کے ہاتھ ایک دوسرے کو قطع کر رہے ہیں، جیسے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوں۔)

قیمت : پچاس روپے

سالانہ خریداری
چار شماروں کی قیمت : دو سو روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال صدر کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز صدر کراچی
کلاسیک شاہراہِ قائداعظم لاہور
بیکن بکس گلگشت ملتان